جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

اتقوا اللہ حق تقاتہ

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

منشورات کی نئی پیشکش

کارڈوں کی دنیا میں نئی روایت

اہم مواقع کے لئے دینی روایت کے حامل خوب صورت کارڈ



نومولود مبارک

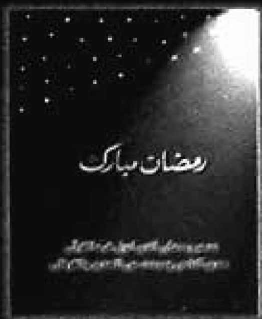
رمضان کارڈ



عیادت کارڈ

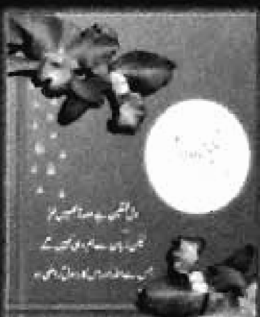


حج مبارک





عید میلاد مبارک



اور تعزیت کارڈ بھی!

اور متعدد دل کش عید کارڈ بھی!



ترقی/کامیابی مبارک

آرڈر فارم

برائے کرم درج ذیل ڈیزائن مطلوبہ تعداد میں ارسال کر دیں۔ منی آرڈر/ڈرافٹ ارسال کر رہا ہوں

ڈیزائن	عیادت کارڈ	نومولود مبارک	رمضان کارڈ	عید میلاد مبارک	حج مبارک	ترقی/کامیابی مبارک	تعزیت کارڈ
مطلوبہ تعداد							

نام

دستخط

پتہ

Post Code.

منشورات منصورہ لاہور فون نمبر: ۵۴۲۵۳۵۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد ۱۲۷، عدد ۸، اگست ۲۰۰۰ء، جمادی الاول ۱۴۲۱ھ

مدیر: پروفیسر خورشید احمد — نائب مدیر: مسلم سجاد

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۵۴۲۵۳۵۶

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۲

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زر سالانہ: ۲۰۰ روپے

بھارت ۳۵۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۵۰۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۷۰۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۵۰ روپے

گزارش

گذشتہ ماہ ستمبر کی ابتدا سے مسلسل خرابیِ صحت کا شکار ہوں۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کا سفر پیش آیا اور چند روز غیر معمولی دماغی محنت کرنی پڑی۔ اس کے بعد سے تو جسمانی قوتوں نے گویا مکمل ہڑتال ہی کر دی جس کا سلسلہ کسی حد تک اب بھی جاری ہے۔ اسی وجہ سے یہ پرچہ اتنی دیر سے نکل رہا ہے اور افسوس ہے کہ اس پرچے میں "اشارات" اور "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" دونوں مفقود ہیں۔

اب رسالے کی اشاعت میں اس قدر تاخیر واقع ہو چکی ہے کہ اس کو بروقت لانے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت ممکن نظر نہیں آتی کہ رجب، شعبان اور رمضان (یعنی ستمبر، اکتوبر اور نومبر) کو ملا کر تینوں مہینوں کا ایک مجموعی نمبر نکال دیا جائے۔ چنانچہ آیندہ پرچہ اسی صورت میں مرتب کیا جا رہا ہے، اور اگر تائید الٰہی شامل حال رہی تو امید ہے کہ وسط نومبر تک ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

اس سہ ماہی نمبر میں آپ کو میرے خطبات یک جا ملیں گے جن کی تعداد ۳۰ کے قریب ہے۔ دو تین سال قبل ان میں سے چار پانچ خطبے متفرق طور پر ترجمان القرآن میں شائع ہوئے تھے۔ باقی سب کے سب اس رسالے کے ناظرین کے لیے نئی چیز ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ مجموعہ "رسالہ دینیات" کا تکملہ ہے۔ رسالہ دینیات میں عقائد اور نظام شریعت کا بیان تھا۔ اس میں روح دین اور عبادات کی تشریح ہے اور زبان و انداز بیان کے اعتبار سے یہ اس سے بھی زیادہ سہل و عام فہم ہے۔

ابوالاعلیٰ

(ترجمان القرآن، جلد ۱۶، عدد ۶، جمادی الاخریٰ ۱۳۵۹ھ، اگست ۱۹۴۰ء، ص ۴۱۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

مسلم معاشرہ' خاندانی منصوبہ بندی اور معاشی ترقی

پروفیسر خورشید احمد

فرد ہو یا قوم' معاشرہ ہو یا ریاست ' ان کی ترقی اور استحکام کے لیے چند عوامل مرکزی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلی اور اہم ترین چیز مقصد حیات اور اس کے نصب العین کے باب میں مکمل یکسوئی اور جمعیت خاطر ہے۔ جن کا حال یہ ہو کہ ؎

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

وہ زندگی میں کبھی کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتے۔ ان کا حال تو قرآن کے الفاظ میں یہ ہے: مُذَبذَبِينَ بَينَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ (النساء ۴:۱۴۳) دو منزلوں یعنی (کفر و ایمان کے درمیان) ڈانواڈول ہیں' نہ پورے اس طرف ہیں اور نہ پورے اس طرف۔

وہی افراد اور اقوام تاریخ سازی کا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں اور زندگی کی رفعتوں کو چھو سکتے ہیں جو اپنے مقصد کا واضح شعور رکھتے ہوں' اپنے آدرش پر مکمل یقین رکھتے ہوں اور اس کے حصول کے لیے جان اور مال کی بازی لگانے کا داعیہ رکھتے ہوں۔ بقول اقبال ؎

یقیں افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

اس کے لیے وحدت افکار اور وحدت کردار دونوں ضروری ہیں ؎

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدت افکار کی' بے وحدت کردار' ہے خام!

مقصد کے باب میں یکسوئی اور وحدت افکار اور وحدت کردار کے ساتھ دوسری ضرورت اپنے زمانے کے حالات' درپیش خطرات اور وقت کے چیلنجوں کا ادراک اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اخلاقی اور مادی وسائل کا حصول اور ان کا بہترین استعمال ہے۔ جو فرد یا قوم محنت' جدوجہد' قربانی اور جہاد کے لیے تیار نہ ہو' وہ کبھی اپنی منزل مقصود کو حاصل نہیں کر سکتی ؂

زندگی مضمون تسخیر است و بس
آرزو افسون تسخیر است و بس

قیادت اور قوم دونوں میں ہم آہنگی' اعتماد اور تعاون ہی کے ذریعے یہ منزل سر کی جا سکتی ہے۔ اگر کسی قوم کی قیادت اور اس کے عوام میں مسلسل کش مکش اور پیکار کی کیفیت ہو' قوم کسی رخ پر جانا چاہتی ہو اور قیادت اسے کسی اور سمت میں لے جانا چاہتی ہو تو ساری قوتیں باہمی جنگ و جدل کی نذر ہو جاتی ہیں اور بالآخر ایسی قوم دشمنوں کے لیے نرم نوالہ بن جاتی ہے۔

ایک زندہ قوم کے لیے ہر دن خود نظری اور خود احتسابی کا دن ہے لیکن ملت اسلامیہ پاکستان کے لیے اگست کا مہینہ خود احتسابی کا ایک خصوصی موقع فراہم کرتا ہے کہ اس کا ہر فرد جائزہ لے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انعام اس پر آزادی اور سرزمین پاکستان پر اقتدار کی شکل میں کیا تھا' اس کا اس نے کتنا حق ادا کیا ہے۔ اسے معلوم کرنا چاہیے کہ یہ ملک و ملت آج جس بحران میں مبتلا ہے اس کی اصل وجوہات کیا ہیں اور کس طرح اس دلدل سے نکل کر قوم اپنی اصل منزل کی طرف پیش قدمی کر سکتی ہے۔

ہماری نگاہ میں جو تین بڑے مرض ہمیں لاحق ہیں وہ یہ ہیں:

۱- مقصد کے بارے میں یقین اور یکسوئی سے محرومی اور فکری اور عملی انتشار۔

۲- عالمی حالات' بیرونی اور اندرونی خطرات اور مسائل سے غفلت۔

۳- قیادت اور قوم کے عزائم و احساسات اور جذبات و اہداف میں عدم مطابقت۔

قیام پاکستان کے اولیں ایام کی کیفیت جن افراد نے بچشم سر دیکھی ہے وہ گواہی دیں گے حکومت کے کارپرداز کرسی اور میز کے بغیر جوش اور جذبے سے اس نئی مملکت کی تعمیر کر رہے تھے اور ہر قربانی دے کر اپنے اس گھر کو بنانا چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی بازی گروں اور مفاد پرستوں نے وہ کھیل کھیلا کہ ساری بازی ہی پلٹ گئی اور آہستہ آہستہ وہ عناصر سیاہ و سفید کے مالک بن گئے جن کا نہ تحریک پاکستان میں کوئی کردار تھا اور نہ وہ ملت اسلامیہ پاکستان کے حقیقی نمایندے اور اس کے عزائم اور تمناؤں کے ترجمان تھے۔ اس انقلاب معکوس نے ملت کو آزادی کی نعمتوں سے محروم کر دیا اور اس کش مکش کو جنم دیا جس نے اس وقت کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک کو سیاسی' معاشی' اخلاقی' تعلیمی' تہذیبی' غرض ہر

اعتبار سے دیوالیہ اور جغرافیائی اعتبار سے دولخت کر دیا۔ آج عالم یہ ہے کہ پہلی مسلمان ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود' ہم سیاسی اور معاشی اعتبار سے بے وقعت ہیں اور عالمی اور علاقائی قوتیں ہمیں اپنے شکنجے میں کسنے اور ہماری آزادی اور نظریاتی و تہذیبی تشخص کو پامال کرنے کے درپے ہیں۔

سیاست دانوں کی بداعمالیوں اور مفاد پرستی سے قوم اتنی نالاں رہی ہے کہ اس نے بار بار فوجی انقلاب کا خیرمقدم کیا لیکن ہربار اسے مایوسی ہی ہوئی--- اور اب ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو برسراقتدار آنے والی قوتوں سے مایوسی کی لہر بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ جو توقعات ابھری تھیں وہ ہوا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ احتساب' صاف ستھری عبوری قیادت' معیشت کی بحالی' بھارت کی علاقائی بالادستی کا مقابلہ' عالمی استعماریت کے خلاف پشتہ بندی' بنیادی انتخابی اصلاحات تاکہ عوام کی حقیقی نمایندہ قیادت جو ایمان' علم' دیانت اور صلاحیت سے مالا مال ہو' زمام کار سنبھال سکے' یہ سارے خواب' خواب ہی محسوس ہوتے ہیں۔ نو مہینے میں بھی ان کی طرف کوئی نمایاں پیش رفت نظر نہیں آتی بلکہ انھی امراض کا اعادہ ہو رہا ہے جو آج تک لاحق ہیں اور قومی و ملی صحت کو کمزور سے کمزور تر کر رہے ہیں۔

۱۱ جولائی کو عالمی یوم آبادی کے موقع پر جن پالیسی رہنما خطوط کا اعلان کیا گیا ہے ان کے آئینے میں موجودہ قیادت کے ان تینوں امراض کی گرفت میں آجانے کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلم معاشرے کا اپنا دینی' اخلاقی' تہذیبی اور تاریخی تشخص ہے۔ تحریک پاکستان کا اصل مقصد اور امت مسلمہ کا اصل مشن اس تشخص کو مستحکم کرنا اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی قائم کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔ یہ جذبہ اس امت کے رگ و پے میں اس طرح سمایا ہوا ہے کہ آج تک کوئی قوت اسے دبا نہیں سکی ہے۔ ہر زمانے میں اندرونی فساد اور بیرونی یلغار نے اسے تہ وبالا کرنے کی کوشش کی ہے مگر ایسی ہر کوشش بالآخر ناکام و نامراد رہی ہے۔ لیکن ایک مختصر سا طبقہ' جو دور استعمار کی پیداوار اور آج کے عالمی استعماری نظام کا آلہ کار ہے' برابر یہ کوشش کر رہا ہے کہ مسلم معاشرے کو اس کی اصل بنیادوں سے کاٹ کر یہاں مغرب کے سیکولر نظریات' اخلاق باختہ تہذیب و تمدن اور ظلم و ناانصافی پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کو مسلط کرے۔ اس کے لیے شب و روز نت نئے شوشے چھوڑے جاتے ہیں۔

تازہ حملہ خاندانی منصوبہ بندی کی شکل میں ہے جسے بڑے بڑے مغالطہ کن (deceptive) معاشی نعروں کے ساتھ جنگی بنیادوں (war footing) پر سر کرنے کے عزائم کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو حضرات بھی موجودہ قیادت کو اس راہ پر ڈال رہے ہیں' اور جو ذمہ داران مملکت اس کھیل کو کھیلنے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں' وہ مسلم معاشرے اور اسلامی اقدار کو درہم برہم کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جن معاشی مقاصد کی دہائی

دے کر یہ کام کیا جا رہا ہے وہ محض ایک دھوکا اور واہمہ ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کی عالمی تحریک' دین و ایمان اور تہذیب و اخلاق کے خلاف ایک گھناؤنی سازش اور مغربی اقوام کے باقی دنیا پر سیاسی غلبے اور تہذیبی تسلط کا ایک پروگرام ہے۔ اگر دینی احکام' ملی ترجیحات اور عالمی حالات اور سازشوں کے علم کے بغیر یہ کام ہو رہا ہے تو یہ جہالت افسوس ناک لیکن ناقابل معافی ہے۔ اور اگر یہ کام عالمی تحریک کا آلہ کار بن کر کیا جا رہا ہے تو ایک قومی جرم اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلم معاشرے اور امت اسلامیہ کے خلاف جنگ کے مترادف ہے۔

امت مسلمہ کے معتبر دینی اور فکری قائدین اس امر پر تقریباً متفق ہیں کہ اگرچہ شریعت انفرادی حالات میں کچھ شرائط کے ساتھ اور شریعت کی نگاہ میں معتبر مصالح کی خاطر ضبط ولادت کی محدود اجازت دیتی ہے اور وہ بھی بہ اکراہ' مگر اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ اسے ایک قومی تحریک کی طرح سرکاری سرپرستی میں زبردستی یا ترغیب کے سہارے ملک و ملت پر مسلط کیا جائے۔ بڑے مضبوط اور محکم دلائل کے ساتھ یہ بات بار بار واضح کی جا چکی ہے۔ پاکستان میں مرکزی حکومت کے استصواب پر' دستور کی دفعہ ۲۲۷ کے تحت قائم اسلامی نظریاتی کونسل جو تمام مکاتب فکر کے علما کے علاوہ قانونی اور معاشی ماہرین اور خواتین کے نمائندوں پر مشتمل ہے' اپنی رائے بڑی تفصیل کے ساتھ اور متفقہ طور پر دے چکی ہے۔ کونسل نے آیات قرآنی' احادیث اور فقہاے امت کے اقوال کی روشنی میں اس رائے کا اظہار کیا ہے:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے عزل کا جواز بلاکراہت قطعاً ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کا جواز نکلتا ہے۔ اس کی مثال طلاق کی سی ہے۔ طلاق کو گو جائز قرار دیا گیا ہے لیکن اسے کبھی پسند نہیں کیا گیا۔ یعنی جس طرح طلاق جائز ہے لیکن اس کو قومی پیمانے پر رواج دینے کی پالیسی اسلام میں ناپسندیدہ اور معاشرے کے لیے ضرر رساں ہے' لہٰذا ممنوع ہے۔ اسی طرح ممانعت حمل کی تدابیر کو قومی پیمانے پر رواج دینے اور اس طرح فحاشی کو فروغ دینے کی پالیسی اسلام میں ناپسندیدہ اور معاشرے کے لیے ضرر رساں ہے' لہٰذا ممنوع ہے۔ البتہ انفرادی سطح پر اگر کسی شادی شدہ عورت کو حمل سے یا بچہ پیدا کرنے سے جان کا خطرہ ہو تو اسے خاص اس کے اپنے حالات کے لیے اجازت دی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا احادیث صرف ضرورت کے وقت انفرادی صورتوں میں کراہت کے ساتھ مانع حمل تدابیر کی اجازت دیتی ہیں۔ علماے اسلام کے جن فتاویٰ میں عزل یا منع حمل کی تدابیر اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس کا تعلق بھی غیر معمولی انفرادی ضرورت سے ہے۔ لیکن قومی پیمانے پر ملک و ملت کا کروڑوں روپے کا قیمتی سرمایہ برباد کر

کے مانع حمل تدابیر کو فروغ دینا اور اس طرح براہ راست فحاشی کو عام کرنا اسلام میں کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا (رپورٹ خاندانی منصوبہ بندی' اسلامی نظریاتی کونسل' اسلام آباد' اپریل ۱۹۸۴ء' ص ۱۰)۔

کونسل نے اپنے دلائل دینے کے بعد یہ سفارش کی ہے:

مندرجہ بالا دلائل و براہین کی روشنی میں کونسل شدت سے محسوس کرتی ہے کہ پاکستان میں ضبط تولید (خاندانی منصوبہ بندی) کی سرکاری سطح پر مہم نہ صرف اسلام کے منافی ہے بلکہ پاکستانی معاشرے کے لیے ہر لحاظ سے سخت تباہ کن ہے' لہٰذا متفقہ طور پر سفارش کرتی ہے کہ:

۱- سرکاری سطح پر ضبط تولید کی مہم فوراً بند کی جائے اور معاشی منصوبہ بندی میں سے ضبط تولید کا پروگرام خارج کیا جائے۔

۲- تمام دوا فروشوں کو ہدایات جاری کی جائیں کہ وہ ضبط تولید کی ادویات و آلات صرف ان شادی شدہ جوڑوں کو فراہم کریں جو نکاح نامہ اور کسی منظور شدہ ڈاکٹر سے اس امر کا سرٹیفکیٹ پیش کریں کہ متعلقہ خاتون کو حمل سے ایسا جانی نقصان پہنچ سکتا ہے جس کا انسداد کسی اور طرح ممکن نہیں۔ اسی قسم کی ہدایت ڈاکٹروں کو نس بندی کے سلسلے میں بھی جاری کی جائیں (ایضاً' ص ۲۰)۔

وزارت صحت کے مزید استصواب پر جو مسز انور رضا کے مسودہ کتاب اسلامی قانون اور خاندانی منصوبہ بندی اور ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ کے نوٹ پر مشتمل تھا اور جس میں خاندانی منصوبہ بندی کے جواز کے دلائل دیے گئے تھے' نظریاتی کونسل نے مفصل محاکمہ کیا اور ایک بار پھر اپنی اس رائے کا اظہار کیا:

قرآن و حدیث کو ان تصریحات کی روشنی میں ہم ضبط تولید کو ایک عمومی تحریک کی صورت میں ملک کے اندر چلانا اور خاندانی منصوبہ بندی کے عنوان سے آبادی کو محدود کرنے کی کوشش کرنا' مسلمان معاشرے کے لیے انتہائی مضر اور نقصان دہ سمجھتے ہیں اور بہ شدت اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے عورتوں کے جسم و نفس کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور اس پر طبی دلائل موجود ہیں' معاشرتی نقصان بھی ہے بلکہ حقیقتاً دیکھا جائے تو اس سے معاشی نقصان بھی ہوتا ہے۔ آبادی کا اضافہ ہو گا تو ذہن و دماغ اور ہاتھ پیر رکھنے والے نوجوان مزید کوشش اور محنت و مشقت کرنے کے نئے نئے وسائل معیشت دریافت کریں گے اور آبادی کے اضافے کے ساتھ معاشی سرگرمی بھی تیز تر ہو جائے گی۔ اگر آبادی محدود ہو گی تو وہ محدود وسائل پر قناعت کر کے محدود دائرے میں رہیں گے اور معاشی ترقی رکی رہے گی۔ درحقیقت ہماری مخالفت کی اصل وجہ تو شرعی ہے اور شرعاً ایسی تحریک کے ممنوع ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس سے یہ سارے نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اجمالاً ان کی طرف اشارہ کر دیا (ایضاً' ص ۷۶)۔

نیز اپنا فیصلہ یوں بیان کیا:

ازروے شریعت ضبط تولید (عزل) کی اجازت انفرادی صورتوں میں مندرجہ ذیل حالات کے پیش نظر ہے: ۱- جب کہ حمل کا ہونا بیوی کی صحت کے لیے نقصان دہ ہو۔ ۲- جب کہ بیوی بیمار ہو اور حمل کے باعث اس کی بیماری میں اضافے کا اندیشہ ہو۔ ۳- جب کہ ماں کا حاملہ ہونا ماں کی چھاتی سے دودھ پیتے بچے کی پرورش کے لیے نقصان دہ ہو۔

یہاں اس حقیقت کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلامی شریعت میں (دیکھیے انعام :۱۵۲، بنی اسرائیل : ۳۱) رزق کی تنگی کا خوف (خشیة املاق) ضبط تولید کے لیے کبھی جائز سبب کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔

ضبط تولید کا جسے خاندانی منصوبہ بندی (اور اب آبادی کی منصوبہ بندی) کہا جاتا ہے، ریاست کی باقاعدہ پالیسی کے طور پر اپنانا اسلامی شریعت کی روح کے خلاف ہے۔ ضبط تولید کی وجہ سے معاشرہ اعتقادی ارتداد، بے حیائی، قومی سطح پر جنسی بے راہ روی، ملکی دفاع اور اقتصادی ترقی کے لیے درکار افرادی قوت میں کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ نیز اس سے نفسیاتی و اعصابی تناؤ کے سبب بسااوقات ماؤں اور بچوں کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

کونسل نے اس دلیل کو رد کرتے ہوئے کہ آبادی میں اضافے سے قومی وسائل کم پڑ جائیں گے رائے ظاہر کی کہ یہ دلیل اعداد و شمار کی رو سے غلط ثابت ہو چکی ہے۔ لیکن مغرب کے پروپیگنڈے باز اپنی بدنیتی کے باعث اسے تیسری دنیا کے ممالک و اقوام کے سامنے برابر پیش کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا کونسل سفارش کرتی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو حکومتی سطح پر ترک کیا جائے (ایضاً، ص ۸۰-۸۱)۔

لام نے بحث و مباحثہ اور تحقیق و جستجو کی آزادی ہر مسلمان کو دی ہے اور اختلافی امور میں تمام آرا ام کی روایت قائم کی ہے لیکن یہ بھی اسلام کا مزاج اور مسلم معاشرے کی شناخت ہے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر سرتسلیم خم کرنے کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ○ (الاحزاب ۳۳:۳۶) کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

ایک طرف پاکستان کی اسلامی فلاحی ریاست کی بات کی جاتی ہے اور نظریاتی اور تہذیبی فریم ورک کا ریفرنس دیا جاتا ہے تو دوسری طرف ایک واضح خلاف شریعت پالیسی کو جنگی بنیادوں پر ملک و ملت پر مسلط کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ صدر مملکت اپنی تمام شرعی وجاہت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ "ماہرین کے مطابق ان مسائل کا بنیادی سبب آبادی میں تیز رفتار اضافہ اور مقابلتاً معاشی وسائل کا سست روی سے بڑھنا ہے۔ وسائل اور مسائل میں توازن پیدا کرنے کے لیے ہمیں آبادی میں اضافے کو معتدل سطح پر لانے کی سعی کرنا ہوگی جس سے ملک کی ہمہ پہلو ترقی کے ساتھ ساتھ عام آدمی بالخصوص زیریں طبقوں کی ترقی و خوش حالی کو یقینی بنایا جا سکے۔ ایک اسلامی فلاحی مملکت کی حیثیت سے یہ ریاست کی ذمہ داری ہے" (عالمی یوم آبادی، ۱۱ جولائی ۲۰۰۰ء، وزارت بہبود آبادی اسلام آباد، صدر کا پیغام)۔

اس کتابچے میں قومی پالیسی برائے آبادی کے مرکزی اہداف کے چوتھے نکتے میں "پاکستان کے عوام کی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی حدود" اور نمایاں جھلکیوں میں "بچوں کی پیدائش کے معمول میں رضاکارانہ تبدیلی" کی بات کی گئی ہے۔

چیف ایگزیکٹو صاحب نے اپنی تقریر میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد اور اس مقدس اعلان کے ساتھ کہ: میں امید کرتا ہوں کہ اضافہ آبادی کی شرح کم کرنے کا حتمی مقصد نظریاتی اور ثقافتی طور پر قابل قبول فریم ورک میں حاصل کیا جائے گا' فرمایا ہے کہ:

> اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ آبادی میں بے روک ٹوک اضافے نے قوم کی ترقیاتی کوششوں اور انفرادی فلاح و بہبود پر نقصان دہ اثر ڈالا ہے۔ اس لیے مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوتی ہے کہ گو کہ پاکستان نے آغاز کرنے میں تاخیر کی ہے لیکن اب وہ اس حوالے سے تبدیلی کے دائرے میں داخل ہو گیا ہے اور اس کی اضافہ آبادی کی شرح ۲.۲ فی صد تک گر گئی ہے۔ لیکن سہل انگاری کی گنجایش نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کھوئے ہوئے وقت کی کمی پوری کرنے کے لیے ہمیں مسئلے کو جنگی بنیادوں پر حل کرنا چاہیے۔

چیف ایگزیکٹو صاحب نے آبادی میں اضافے کی شرح کو ۱.۹ فی صد تک لانے کی تاکید فرمائی ہے اور کہا ہے کہ کاش آبادی کم کرنے کا کام پہلے سے شروع ہو جاتا تاکہ ملک کی آبادی ۱۳۵ ملین کی بجائے زیادہ سے زیادہ ۸۰ یا ۹۰ ملین ہوتی۔ انھوں نے وہی گھسے پٹے دلائل بھی نقل فرما دیے ہیں جن کا وعظ ۵۰ سال سے مغربی سیاست دان اور استعماری ادارے کر رہے ہیں اور جن کی جگالی تیسری دنیا کے سارے ہی ممالک کے حکمران اور این جی اوز کر رہے ہیں۔

محترمہ عطیہ عنایت اللہ جنرل ضیاء الحق، وزیراعظم جونیجو اور وزیراعظم نواز شریف کے قابل اعتماد حلقے

کی رکن رکین رہی ہیں اور اب چیف ایگزیکٹو کی قومی سلامتی کونسل کی رکن اور ان کی اس مہم کی سپہ سالار ہیں' سنہ ۲۰۰۳ء تک شرح آبادی میں اضافے کو ۱.۹ فی صد تک لانے کے عزم کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ مانع حمل ادویہ اور آلات کو ۴۰ فی صد آبادی تک لے جانے کی قسم کھا رہی ہیں اور اسکولوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم عام کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہیں۔ انھوں نے ایک پیراگراف میں ۳ بار "ان شاء اللہ" کہہ کر اس جہاد کا اعلان کیا ہے۔ وہ جنرل مشرف صاحب کی پشت پناہی پر نازاں ہیں اور ان کو اپنی اچھی توقعات کی خوش خبری سنا رہی ہیں۔

ایک طرف اسلام کے دعوے اور دستور کی اسلامی دفعات کے احیا کا کارنامہ' اور دوسری طرف "بسم اللہ" اور "ان شاء اللہ" کے ساتھ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکامات اور مسلم معاشرے کی اقدار اور شناخت کے خلاف اعلان جنگ ___ یہی وہ قول و عمل کا تضاد' فکرونظر کی ژولیدگی اور قوم اور اس کے جذبات و احساسات سے تصادم اور ٹکراؤ ہے جو ہماری قومی زندگی کو اندر سے گھن کی طرح کھا رہا ہے اور وسائل کے ضیاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ چیف ایگزیکٹو صاحب شکایت کناں ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی کی کوشش عوام کی شرکت نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو رہی لیکن وہ اتنا سمجھنے سے عاری ہیں کہ اگر آپ ان کے ایمان' اقدار اور تہذیبی روایات کے خلاف جنگ کریں گے تو وہ آپ سے تعاون کیسے کر سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر اللہ کی رحمت اور برکت اس نظام کو کیسے حاصل ہو سکتی ہے جو اللہ سے بغاوت' نظریاتی تناقص اور تہذیبی شترگربگی کا شکار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایسے لوگوں کو بڑی سخت تنبیہہ کی ہے اور یہ اس کی رحمت ہی ہے کہ ہمیں معمولی تنبیہیں ہی کر رہا ہے ورنہ ہماری قیادت تو اللہ کے عذاب کو کھلم کھلا دعوت دے رہی ہے۔

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ (الانفال ۸:۵۲-۵۳) انھوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔

العیاذ باللّٰہ... اللہ تعالیٰ اس قوم کو اور اس کے رہنماؤں کو ہدایت دے کہ وہ اللہ سے بغاوت اور ظلم کے راستے سے بچیں' اللہ کی اطاعت کریں اور مسلم معاشرے کے مزاج اور روایت کے مطابق راہ عمل اختیار کریں۔ اللہ اس قوم کو اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور اسے توفیق دے کہ وہ حکمرانوں کے ان غلط طور طریقوں اور پالیسیوں کو تبدیل کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جائے۔ یہی راستہ اللہ کے غضب سے بچنے کا

واحد راستہ ہے۔

ایک مسلمان معاشرے اور قوم کی حیثیت سے ہمارے لیے سب سے اہم پہلو دینی اور اخلاقی ہی ہے کہ اس پر ہماری دنیا اور آخرت کا انحصار ہے۔ لیکن صرف اطمینان قلب کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسئلے کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں کا مطالعہ کرلیا جائے تاکہ قوم اور اس کے حکمرانوں کے سامنے دلائل پوری قوت کے ساتھ سامنے آجائیں اور جو کھیل عالمی سطح پر کھیلا جا رہا ہے اس کا پورا تانا بانا بے نقاب ہو جائے۔ جہاں ہمارا دل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم پر مطمئن اور مسرور ہے' وہیں ہم الحمدللہ بڑے مضبوط اور محکم عقلی اور تاریخی دلائل کی بنیاد پر خاندانی منصوبہ بندی کو انسانیت کے خلاف ایک ظلم' تہذیب و شرافت کے خلاف ایک جنگ اور معاشی اعتبار سے ایک مکمل خسارے کا سودا سمجھتے ہیں اور بڑے انکسار لیکن بڑے اعتماد کے ساتھ خاندانی منصوبہ بندی کے مویدین اور پرچارکوں سے کہتے ہیں: ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین' لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ افراد خاندان کی تعداد کے تعین کا اختیار کسے حاصل ہے؟ یہ تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کا بنیادی نکتہ ہے۔ آیا یہ حق شوہر اور بیوی کا ہے کہ اللہ کی مشیت کے تحت اپنی آزاد مرضی سے اپنے خاندان کے معاملات کو طے کریں یا یہ حق کسی حکومت' عالمی ادارے' اقوام متحدہ یا سوپر پاور کا ہے کہ وہ دنیا بھر کے انسانوں کے لیے یہ طے کریں کہ ان کے خاندان میں کب اضافہ ہو اور وہ کتنا بڑا خاندان رکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آبادی کی منصوبہ بندی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کے تحت ہو رہی ہے اور اس میں انسان کا دخل جزوی اور محض ایک وسیلے کا ہے۔ لیکن اللہ کی اس مشیت کے تحت شرف آدمیت کے بھی کچھ اصول و آداب ہیں اور ان میں انسانی نسل کی بقا اور افزایش کے لیے نکاح اور خاندان کا نظام بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

جس طرح جبر کا نکاح باطل ہے اسی طرح جبریا بیرونی حکم اور پلان کے تحت افزایش نسل کی صورت گری فرد (شوہر اور بیوی) کے بنیادی حقوق کی نفی' شرف انسانی کی تذلیل اور ایک نوع کی غلامی کی ترویج کے مترادف ہے۔ جو لوگ انسانی حقوق کا راگ دن رات الاپتے رہتے ہیں اور نظری طور پر انسانی حقوق میں خاندان قائم کرنے کے حق کو بھی تسلیم کرتے ہیں' ان کے لیے یہ موقف اختیار کرنے کا کیا جواز ہے کہ یہ حق خاندان کے کار فرما (شوہر اور بیوی) کا نہیں کہ وہ اپنے مالک کے فضل سے اپنے لیے اپنی اولاد کی شکل میں آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل کریں بلکہ یہ اختیار حکومت کا' بلکہ عالمی اداروں اور این جی اوز کا ہے کہ وہ ان کے لیے افراد خاندان کی تعداد طے کریں۔ کوئی بیرونی قوت کیوں یہ طے کرے کہ ایک خاندان میں ایک

بچہ ہونا چاہیے یا دو یا تین' اور ایک ملک کی آبادی میں اضافے کی شرح ۲.۲ فی صد ہو یا ۱.۹ فی صد اور ایک ملک کی آبادی ۱۴ کروڑ ہو یا ۸ کروڑ۔

سب سے اہم سوال انسانی حقوق اور شرف انسانیت کے تحفظ کا ہے۔ اور اس پہلو سے تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی کی عالمی تحریک اور حکومتی حکمت عملی ایک نئی طرز کی غلامی اور محکومی کا نظام ہے۔ جس طرح ماضی کے غلاموں کو یہ حق نہ تھا کہ اپنی مرضی سے شادی کریں اور خاندان آباد کریں' اسی طرح آزادی اور حقوق انسانی کے سارے دعوے کے باوجود خاندان کے دائرے میں جبر کے اس نظام کے تحت فرد سے اس کا یہ حق چھینا جا رہا ہے اور اسے حکومت اور عالمی طاقتوں کے حکم کا تابع مہمل بنایا جا رہا ہے۔ غلامی کے یہ طوق بڑے خوب صورت ناموں سے ہماری گردنوں میں ڈالے جا رہے ہیں' کبھی اسے ضبط ولادت کہا جاتا ہے' کبھی خاندانی منصوبہ بندی' کبھی خاندانی بہبود! ایک طرف تولیدی حقوق کی بات ہوتی ہے تو دوسری طرف تولیدی نظام کو حکومتی فیصلے اور جبر سے بلکہ جنگی بنیادوں پر مسلط کرنے کے عزائم کا اظہار ہوتا ہے۔

اسلام تو اس معاملے میں اتنا حساس ہے کہ عائلی زندگی میں شوہر اور بیوی کو باہم مشورے اور رضامندی سے حقوق کی ادائگی کا سلیقہ سکھاتا ہے اور عزل' جس کی خاص حالات میں بہ کراہت اجازت ہے' اس کے بارے میں فقہا کی ایک تعداد نے یہ وضاحت بھی ضروری سمجھی ہے کہ شوہر' بیوی کے مشورے اور اجازت سے کرے۔ لیکن تحدید نسل کے فلسفے اور اس کی عالمگیر تحریک نے شوہر اور بیوی کے اس حق پر شب خون مارا ہے' اور اس انفرادی' نجی' نازک اور اخلاقی معاملے کو وزارت آبادی اور عالمی اداروں کے احکام کا پابند کرنے کا شیطانی کھیل کھیلا ہے۔ اس کے لیے وہ ذرائع تجویز کیے ہیں جو معاشرے سے شرم و حیا کو رخصت کر دیں' جنسی شعور (sex awareness) اور جنسی تعلیم کے نام پر آزاد جنسی زندگی کے دروازے کھولے جا رہے ہیں تاکہ خاندان اور معاشرہ بے راہ روی اور تباہی کا شکار ہو جائے۔

یہ تحریک' انسان کی آزادی' خاندان کے نظام اور معاشرے میں عفت و عصمت کے تحفظ کے لیے ضرب کاری کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ خاندانی معاملات میں حکومت' این جی اوز اور عالمی ایجنسیوں کی مداخلت کا ایک ایسا نظام ہے جو درحقیقت غلامی کا ایک نیا جال ہے۔

بظاہر خاندانی منصوبہ کا یہ نظام رضاکارانہ کہا جاتا ہے' مگر اس کے لیے ترغیب و ترہیب کا ہر ہتھکنڈا استعمال کیا جا رہا ہے۔ بیرونی امداد اس کے ساتھ مشروط ہے۔ پروپیگنڈے کا ایک طوفان ہے' جس نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور ہٹلر کے وزیر اطلاعات جنرل گوئبلز کے اس اصول پر' کہ ایک جھوٹ کو اتنی بار اور اس تعدی سے نشر کرو کہ اس کو سچ مان لیا جائے' عمل ہو رہا ہے۔ کبھی سائنس کا سہارا لیا جاتا ہے' کبھی معاشیات کی دہائی دی جاتی ہے' کبھی صحت اور توانائی کا رونا رویا جاتا ہے اور کبھی قحط اور

افلاس کے عفریت سے ڈرایا جاتا ہے۔ ثقافتی استعمار کا ہر حربہ استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ جبر کے ہتھیار بھی' کھلے اور چھپے' استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا اس لیے کہ اس تحریک کی سو سالہ تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ:

> تیسری دنیا کی حکومتیں اب ضبط ولادت کی تعلیم کی پشت پناہی کر رہی ہیں لیکن چین میں اس کے سفاکانہ اطلاق کے ذریعے کامیابی کی مثال کے علاوہ اس نے آبادی میں تیز رفتار اضافے کو کم کرنے میں ابھی تک کوئی اثر نہیں ڈالا ہے A History of the World in the Twentieth Century از جے اے ایس گران ویل' ہارورڈ یونی ورسٹی پریس' ۱۹۹۴ء' ص ۲)۔

حقیقت ہے کہ چین (مابعد ماؤ کا دور) ہو یا بھارت (اندرا گاندھی کی متشددانہ پالیسی)' جہاں جبری نس بندی اور لازمی تحدید کی پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ریاست کی قوت' جیل' جرمانہ اور جسمانی تشدد کے حربے استعمال کیے گئے' سب کچھ عالمی اداروں خصوصیت سے ورلڈ بنک اور اقوام متحدہ کے شعبہ آبادی کے ایما اور ان کی آشیرباد سے کیا گیا۔ بقول الزبتھ لیاگن (Elizabeth Liagin):

> حقیقت یہ ہے کہ "ایک جوڑا' ایک بچہ" کی بدنام زمانہ چینی پالیسی' جو نس بندی اور آخری مہینوں تک کے اسقاط حمل کے ساتھ ایک مکمل پالیسی تھی' ورلڈ بنک کی ۸۰ کے عشرے میں آبادی' غذا اور صحت کے شعبے کے لیے ۲۰۰ ملین ڈالر کی بہت بڑے پیمانے پر مدد سے نافذ کی گئی۔ بھارت میں "آبادی ایمرجنسی" کے نتیجے میں لاکھوں افراد کی جبریہ نس بندی ہوئی اور اس کے نتیجے میں ہزاروں اموات واقع ہوئیں۔ اسے ورلڈ بنک نے ۱۹۷۱ء کے اپنے آبادی پراجیکٹ میں ۲۱ ملین ڈالر کی امداد دی (Excessive Force: Power, Politics and Population Control' از الزبتھ لیاگن' واشنگٹن' ص ۸۲)۔

ورلڈ بنک کے انسانی حقوق کے مسئلے سے کس طرح کنی کتراتی ہے اس کا اندازہ اس بحث سے کیجیے جو اس ادارے کے ایک ورکنگ پیپر (Costs, Payments and Incentives in Family Planning Programs) میں کی گئی ہے۔ پہلے ذرا سوال کو سمجھ لیں:

> اخلاقی مخمصے کا ایک نازک پہلو اس کش مکش میں پایا جاتا ہے جو ایک حکومت کے' اپنی موجودہ اور مستقبل کی نسلوں کے تحفظ کے معمول کے فرائض' اور موجودہ افراد کے' اپنے خاندان کے افراد کی تعداد طے کرنے کے حق کے آزادانہ استعمال کے درمیان ہوتی ہے۔

اسی لیے ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ کی ایک دستاویز World Population Plan of Action نے بھی بڑی چابک دستی سے اس مسئلے کو اٹھایا تھا اور مذکورہ ورکنگ پیپر میں بھی اس دستاویز کا یہ حوالہ دیا گیا ہے کہ: تمام جوڑوں اور افراد کو اپنے بچوں کی تعداد اور پیدائش کے وقفوں کا آزادانہ اور ذمہ دارانہ انداز سے

تعین کرنے کا بنیادی حق حاصل ہے۔

لیکن یہ حق تسلیم کرنے کے بعد نتیجہ اور فیصلہ کیا کیا جاتا ہے؟ ذرا غور سے پڑھیے:

> تضادات واضح ہیں۔ جوڑے اور افراد "آزادانہ" فیصلہ کر سکتے ہیں مگر یہ ذمہ دارانہ بھی ہو اور دیگر ضروریات کی روشنی میں بھی۔ جیسا کہ دوسرے بہت سے انسانی حقوق کے بارے میں ہے، یہ امر کہ لوگ اپنے بچوں کی تعداد اور پیدائش میں وقفوں کے تعین کا حق رکھتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حکومت اس میں ہرگز مداخلت نہیں کر سکتی (ملاحظہ ہو Ethical Approach to Family Planning in Africa فریڈ ٹی سائے، اور کے نیومین)۔

لیجیے، ایک جملے سے سارے انسانی حقوق کا جنازہ نکل گیا۔ اصل مسئلہ، جیسا کہ ہم آگے ثابت کریں گے انسانی حقوق، یا انسانی مفاد کا نہیں بلکہ بڑی طاقتوں کے سیاسی مفادات، عالمی بالادستی اور کلچرل بالادستی کا ہے۔ اس کے لیے فرد کی آزادی کی نفی اور قوموں کی محکومی دونوں ضروری ہیں۔ ضرورت ترقی پذیر ممالک کی نہیں، سامراجی قوتوں کی ہے اور سب کو اس کے لیے آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔ الزبتھ لیاگن صاف الفاظ میں اعتراف کرتی ہے کہ:

> ستم ظریفی یہ ہے کہ ورلڈ بنک اپنے پروگراموں کو اس واضح تصور کے ساتھ، جسے بعض اوقات واضح طور پر بیان بھی کر دیا جاتا ہے، روبہ عمل لاتا ہے کہ تحدید آبادی غیر ضروری ہے اور جنوبی کرہ ارض کی ترقی پذیر معیشتوں کے لیے ضرر رساں ہے (ایضاً، ص ۸۳)۔

فرد کی یہ تذلیل، حقوق انسانی کی یہ پامالی اور شرف انسانیت کی یہ تحقیر، آزادی، جمہوریت اور معاشی ترقی کے نام پر کی جا رہی ہے اور اس پر کوئی شرم اور ندامت محسوس نہیں کی جاتی بلکہ کھلے بندوں اپنے اس "حق" کا اعلان ہوتا ہے کہ عالمی اداروں اور مغربی اقوام کے لیے دوسروں کی نسل کشی جائز ہے اور ان کے لیے یہ سب حلال ہے! مغربی تہذیب کے ایک بڑے علم بردار اور دانش ور برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب Marriage and Morals (مطبوعہ لندن ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۱) میں پوری صفائی اور ڈھٹائی سے کہہ دیا تھا کہ:

> اگر دوسری قومیں [مراد ہے: مشرقی اور افریقی قومیں، خصوصاً مسلم اقوام] اپنی زیادہ شرح پیدائش سے دنیا میں توازن اقتدار پلٹ رہی ہیں تو [ہماری یعنی مغربی] طاقت ور فوجی قوتیں، اس صورت حال پر، آرام سے نہیں بیٹھی رہیں گی۔

اپنے مفادات اور بالادستی کے تحفظ کے لیے اگر وہ جنگ کے ذریعے آبادیوں کا صفایا کریں، یا خانہ جنگیوں کو پروان چڑھا کر (جیسا روانڈا میں حال ہی میں کیا گیا) یا اختیاری اور جبری تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے کسی ملک کی آبادی کو محدود کر دیں تو یہ بھی ان کا "حق" ہے۔ اقبال نے مغربی تہذیب کے اسی جنون کا ادراک کرتے ہوئے کہا تھا:

تہذیب کا کمال' شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے' اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

دوسرا بنیادی سوال یہ ہے کہ جو خود اس دنیا میں آگئے اور اس کی نعمتوں سے دل کھول کر متمتع ہو رہے ہیں انھیں کس دلیل اور کس کی سند پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسروں کے اس دنیا میں آنے پر پابندیاں لگائیں اور گنتی کر کے طے کریں کہ اتنے انسان پیدا ہو سکتے ہیں اور اتنے نہیں؟ اللہ نے تو یہ حق اپنے لیے محفوظ رکھا تھا:

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ (اٰل عمرٰن ۳: ۶) اللہ ہی وہ ذات ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے رحم مادر میں تمھاری صورت گری کرتا ہے--- اور یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ ۝ اَوْیُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا (الشوریٰ ۴۲: ۴۹-۵۰) وہ جس کو چاہے لڑکیاں دے اور جس کو چاہے لڑکے دے اور جس کو چاہے لڑکے اور لڑکیاں' دونوں دے اور جس کو چاہے بانجھ بنادے کہ اس کی اولاد نہ ہو۔

مگر اب خدائی کے دعوے دار وہ بن گئے ہیں جو بزعم خود یہ جانتے ہیں کہ کتنے انسانوں کا دنیا میں آنا باعث خیر ہے اور کتنوں کا راستہ روکنا ان کا استحقاق ہے۔ محترمہ عطیہ عنایت اللہ اس طرح گوہرافشانی فرماتی ہیں کہ: اس سال کی عالمی رپورٹ کا مرکزی خیال خطرات سے محفوظ زچگی (safe motherhood) ہے۔ اس حوالے سے اضافہ آبادی کی شرح میں کمی کا براہ راست اور فوری نتیجہ' نوزائیدہ بچوں کی ہلاکت میں کمی ہے۔ آزمودہ حکمت عملی کے ذریعے ہم اللہ کی مرضی سے ۲۰۰۳ء تک ہر روز ۴۵۰ بچوں اور ۲۰ ماؤں کی زندگی بچا سکتے ہیں۔

اور اس لن ترانی میں وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ حکومت کی ان دست درازیوں سے کتنی گودیں ہری ہونے سے رہ گئیں' کتنی ہی معصوم جانوں کا دنیا میں آنے سے پہلے ہی گلا گھونٹ دیا گیا' کتنے غنچے کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے' کتنے خاندان اپنے مستقبل کے نگہبانوں سے محروم رہ گئے اور کتنے ماں باپ یہ کہتے رہ گئے کہ "اے مرے لخت جگر' نور نظر' پیدا نہ ہو!"

یہی وہ دعویٰ ہے جو تحریک تحدید نسل کے سارے مبلغ بڑے زعم سے کرتے ہیں۔ مغرب میں ان کے سرخیل کنگزلے ڈیوس (Kingsley Davis) اور پال الرش (Paul Ehrlich) ہیں۔ ڈیوس کا ارشاد ہے:

مجھے آج تک کوئی یہ نہیں بتا سکا کہ ہمیں ان اضافی ۲ کروڑ ۳ لاکھ افراد کی کیا ضرورت ہے

(نیوزویک ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء' ص ۸۷)۔

اور پال الرش کا فتویٰ ہے:

میں کسی ایسے سبب کا تصور نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے امریکہ میں ۱۵ کروڑ سے زیادہ افراد ہوں؟ اور نہ کسی دوسرے شخص نے اب تک مجھے ایسا کوئی سبب بتایا ہے (Saturday Review' ۱۱ مارچ ۱۹۷۲ء' ص ۴۵)۔

امریکہ کی یونی ورسٹی آف میری لینڈ کا پروفیسر جولین سائمن جس نے آبادی کے مسئلے پر دسیوں کتب تصنیف کی ہیں اور جس کی تحقیقات کو جرمن نوبل انعام یافتہ پروفیسر ہائک (V.A. Hayek) دور حاضر کی "بہترین تحقیقی کتب" قرار دیتا ہے' ان دعووں کی قلعی یوں کھولتا ہے:

آبادی کے بارے میں جتنا لٹریچر میں نے پڑھا ہے' اس میں ایک بات کا ذکر نہ ہونے سے حیرانی ہوئی ہے' اور تکلیف بھی۔ ایک انسان وجود میں لانا اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنانا اسی طرح ایک اچھی بات ہے جس طرح ایک زندہ انسان کی زندگی بچانا اور تحفظ دینا ایک اچھی بات ہے۔ بلاشبہ موت اور کسی پیدایش کو روکنا ایک جیسی بات نہیں ہے' تاہم میں ان لوگوں کی فکر میں کوئی منطق نہیں پاتا جو ایک دور دراز ملک میں نسبتاً کم تعداد لوگوں کے بھوک سے مر جانے پر خوف زدہ ہیں' (اور بہ ظاہر اس سے زیادہ خوف زدہ جتنے کہ وہ اس دور دراز ملک میں سیاسی قتل کے ذریعے ہونے والی اموات پر ہیں' یا خود اپنے ملک میں حادثات میں ہونے والی اموات پر ہیں) لیکن اس بات پر خوشی مناتے ہیں کہ ایسے لاکھوں کروڑوں لوگ اس دنیا میں اپنی زندگی نہیں گزاریں گے' جو اگر ان کی پیدایش روکی نہ جاتی تو گزارتے۔ میں ڈیوس اور الرش کو زیادہ بچے پیدا کرنے اور ملک میں زیادہ تارکین وطن لینے کے لیے ایک سے زیادہ اسباب بتا سکتا ہوں جن میں سب سے کم اہم یہ ہے کہ زیادہ آبادی کا مطلب ہمارے پوتوں اور پڑپوتوں کے لیے زیادہ بلند معیار زندگی ہو گا (The Ultimate Resource' از جولین سائمن' یونی ورسٹی آف پرنسٹن پریس' ۱۹۹۶ء' ص xxxii)۔

قرآن نے کتنے غضب ناک انداز میں ان معصوم لڑکیوں کے بارے میں' جواب دہی اور بازپرس کی وعید دی ہے جو زندہ درگور کی جاتی تھیں۔ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ (التکویر ۸۱ : ۸-۹) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟

کیا جن معصوم جانوں کو آنے سے پہلے ہی ختم کیا جا رہا ہے ان کے بارے میں سوال نہ ہو گا' خواہ ان کو

وجود میں آنے سے روکنے کے لیے کوئی بھی طریقہ اور راستہ اختیار کیا جائے؟

اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا ہے اور اس کے لیے زمین و آسمان کی وسعتوں کو مسخر کر دیا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

رزق کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اس نے افلاس کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کو حرام قرار دیا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۱) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔

اولاد کا قتل یا ان کو اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی روک دینا اللہ کے باغیوں کو بڑا اچھا لگتا ہے مگر اللہ اسے بربادی کا راستہ قرار دیتا ہے: وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ (الانعام ۶: ۱۳۷) اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوش نما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔

انسان پر اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں کیا جا سکتا کہ محض اپنے عیش و آرام کے تحفظ کی خاطر، خدا کی خدائی میں دخل اندازی کی جائے اور آنے والی روحوں کا راستہ روکا جائے ــــ ایسے موہوم، بودے اور برخود غلط تصورات کی بنیاد پر کہ وسائل کم ہیں، معاشی ترقی رک جائے گی، زمین پر گنجایش نہیں، ماحول خراب ہو رہا ہے، معیار زندگی بلند نہیں ہو پا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں سب کے لیے وافر گنجایش پیدا کر رکھی ہے، کمی اگر ہے تو انسانی کوشش اور جدوجہد کی۔ شیخ سعدیؒ نے درست فرمایا:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکار اند
تا تو نانے بہ کف آری و بہ غفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

(ابر، ہوا، سورج، آسمان، ان سب کی مدد سے تو اس قابل ہوتا ہے کہ ایک روٹی اپنے ہاتھ میں لے۔ اسے غفلت سے نہ کھا۔ یہ سب تیرے لیے ہر وقت مصروف ہیں اور تیرے فرماں بردار ہیں۔ یہ انصاف کی بات نہیں کہ تو فرماں بردار نہ بنے)۔　　(جاری)

اشارات کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے: www.jamaat.org

15

عالمی ایجنڈے کے تحت مردہ بحثوں کو زندہ کیا جا رہا ہے

مسلم ممالک کی آبادی کم کرنے کے لیے غیر ملکی امداد کے دہانے کھول دیے گئے ہیں

حکومت اپنی ناکام معاشی پالیسیوں کا ذمہ دار اضافہ آبادی کو ٹھہرا رہی ہے

ذرائع ابلاغ پر مادر پدر آزاد معاشرے کی مہم جاری ہے

خواتین کو حقوق و اختیارات کے نام سے گمراہ کیا جا رہا ہے

مسئلے کی حقیقت جاننے کے لیے

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کی

اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی

کا مطالعہ کیجیے

مختصر لیکن برہان قاطع

۴۰ سال بعد بھی تروتازہ، چشم کشا، راہ نما

صفحات: ۲۴، قیمت: ۶ روپے صرف

قیام پاکستان کا پس منظر

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک ایک صحافی کی حیثیت سے میں ہندستان کے سیاسی حالات اور ان میں مسلمانوں کی حیثیت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اس مطالعے نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ ہندستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے یہاں برطانوی حکومت کے زیر اثر جو جمہوری نظام بنایا جا رہا ہے' اس میں مسلمانوں کے لیے کسی حیثیت سے بھی کوئی خیر نہیں ہے اور اس نظام میں ان کو خواہ کیسے ہی آئینی تحفظات دے دیے جائیں' غیر مسلم اکثریت کا غلبہ ان کے لیے درحقیقت کسی تحفظ کو بھی مفید اور موثر نہ رہنے دے گا۔ میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ کچھ آئینی تحفظات حاصل کر کے انگریزی حکومت کے بل بوتے پر جینا سراسر نادانی ہے کیوں کہ انگریزوں کو ہمیشہ یہاں نہیں رہنا ہے' ملک آخرکار آزاد ہو کر رہے گا اور آزاد ہندستان میں غیر مسلم اکثریت کی حکمرانی مسلمانوں کے دین' اخلاق' تہذیب' تمدن' معاشرت اور معیشت سب کو تباہ کر کے رکھ دے گی' یہاں تک کہ ان کا الگ امتیازی وجود تحلیل ہو کر رہ جائے گا۔

اس زمانے میں' اور اس کے بعد چند سال تک اسلام کا جو مطالعہ میں نے کیا' اس کی مدد سے میں یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ مسلمانوں کے اس حالت کو پہنچنے کی وجہ کیا ہے اور اس گرداب سے وہ کس طرح نکل سکتے ہیں؟ اس مسئلے پر میں نے جتنا بھی غور کیا اتنا ہی مجھے یقین حاصل ہوتا چلا گیا کہ ہندستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں مسلمان جس زوال و انحطاط اور مغلوبی و محکومی کے شکار ہیں' اس کی واحد وجہ ان کا اپنے اس مشن کو بھول جانا ہے جو کتاب اللہ کی حامل اور رسول اکرمؐ کی پیرو امت ہونے کی حیثیت سے ان کے سپرد کیا گیا تھا' اور اب اس حالت سے ان کے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ پھر سے اس مشن کے علم بردار بنیں۔ مگر اصل سوال عمل کا تھا کہ یہ کام ہو تو کیسے؟

میں دیکھ رہا تھا کہ عام مسلمان دین کے عاشق تو ضرور ہیں مگر اس کو جانتے اور سمجھتے نہیں ہیں۔ تعلیم یافتہ اور بااثر طبقے صرف دین سے ناواقف ہی نہیں وقت کی غالب تہذیب کے افکار و نظریات اور طریقوں سے بری طرح متاثر بھی ہیں اور مذہبی لوگوں میں دین کا تصور بس نماز' روزے اور چند مذ؟ رسوم تک محدود ہے۔ اس حالت میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ سارے مسلمان اس مشن کو سمجھ بھی لیں اور اس کے علم بردار بھی بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ عملاً اگر کچھ ممکن تھا تو یہ کہ اسلام کو بحیثیت ایک جامع اور

ہمہ گیر نظام زندگی کے پیش کیا جائے۔ اس کے ایک ایک پہلو کو معقول طریقے سے واضح کیا جائے' دماغوں کی ان تمام الجھنوں کو صاف کیا جائے جو غیر اسلامی علوم و افکار اور تہذیب و تمدن کے غلبے سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اسلامی نظام کے برحق اور غیر اسلامی نظاموں کے باطل ہونے کو بہ دلائل ثابت کیا جائے اور باطل کو مٹا کر حق کو عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد کا جذبہ دلوں میں ابھارا جائے۔ یہی کام تھا جسے میں نے ۱۹۳۳ء میں شروع کیا جب رسالہ ترجمان القرآن کی ادارت میرے ہاتھ میں آئی۔ میرے پیش نظر یہ تھا کہ جب پڑھے لکھے لوگوں کی ایک تعداد ان خیالات کو قبول کر کے اس نصب العین کے لیا کام کرنے پر آمادہ ہو جائے تو انھیں منظم کر کے اور ان کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے اسلام کو بحیثیت نظام زندگی قائم کرنے کی باقاعدہ تحریک کا آغاز کر دیا جائے۔

یہ کام ابھی جاری تھا کہ ۱۹۳۷ء میں وہ تمام خطرات سامنے آگئے جن کے وقوع میں آنے کا اندیشہ تھا۔ برعظیم ہند کے تمام لوگوں کو ایک قوم فرض کر کے غیر مسلم اکثریت کو حکمران بنانے کا عمل شروع ہوتے ہی اس کے فطری اور منطقی نتائج اندیشوں سے گزر کر حقیقت کی صورت میں نمودار ہونے لگے۔ مسلمانوں کے جداگانہ قومی وجود اور ان کی اپنی مستقل تہذیب کی نفی کی جانے لگی۔ غیر مسلم اکثریت نے ان پر اپنی زبان' تہذیب اور رسوم کو مسلط کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں سے اجتماعی طور پر کوئی معاملہ کرنے کے بجائے ان کے افراد کو براہ راست مخاطب کر کے ہندستانی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش بڑے پیمانے پر کی جانے لگی جس میں بدقسمتی سے علما کا ایک گروہ بھی شریک ہو گیا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ اقامت دین کی تحریک کے لیے جس قوم سے اولین کارکن بہم پہنچنے کی امید کی جا سکتی تھی اسی کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی اصل دعوت کا کام پہلے سے زیادہ تیز کر دینے کے ساتھ ساتھ وطنی قومیت میں مسلمانوں کے جذب ہونے کو روکنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ اسی مقصد کے لیے میں نے مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کا پہلا حصہ ۱۹۳۷ء اور دوسرا ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ پھر مسئلہ قومیت کے نام سے ایک اور کتاب لکھی جو پہلے ۱۹۳۹ء میں اور پھر کچھ مزید اضافوں کے ساتھ جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ اب یہ تینوں کتابیں تحریک آزادی ہند اور مسلمان' حصہ اول کے نام سے ایک ہی جلد میں جمع کر دی گئی ہیں۔ ان تینوں کتابوں میں یہ حقیقت دلائل و شواہد کے ساتھ ثابت کی گئی تھی کہ مسلمان کسی وطنی قومیت کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایک الگ قوم ہیں' جس کا عقیدہ و ایمان' جس کے افکار و نظریات' جس کے اصول اخلاق و تہذیب اور جس کے نظام زندگی میں سے کوئی چیز بھی ان عناصر کے ساتھ میل نہیں رکھتی جو ہندستان میں آباد ہیں۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کو خبردار کیا گیا تھا کہ "وطنی قومیت" کے جھوٹے' بے اصل اور پُرفریب نام سے غیر مسلم اکثریت کی جو

نام نہاد جمہوری حکومت قائم ہو گی وہ ان کے لیے کس قدر تباہ کن ہو گی۔

یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلم لیگ کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک زبردست عوامی قوت کی حیثیت سے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ابھری۔ وطنی قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا، مسلمان اس کے فتنے سے بچ گئے اور ان کے اندر یہ جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ ہندستان میں ان کی قومیت کے امتیازی وجود کو ایک آزاد اور مستقل حیثیت حاصل ہونی چاہیے، لیکن یہ طے ہونا ابھی باقی تھا کہ اس کی عملی شکل کیا ہو۔ مختلف لوگ اس کے بارے میں مختلف تجویزیں پیش کر رہے تھے جن میں تین متبادل تجویزیں میری بھی تھیں جو میں نے ۱۹۳۸ء میں پیش کیں۔ ایک پُرجوش تحریک آگے بڑھ رہی تھی اور مسلمانوں کا قومی مقصد بتدریج ایک شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں وہ تقسیم ہند کی تجویز پر مرتکز ہو گیا۔ ابتداً اس تجویز میں "پاکستان" کا نام شامل نہ تھا۔ مگر یہ نام پہلے ہی سے عوام میں مقبول ہو رہا تھا۔ اس لیے آپ سے آپ زیر تجویز ملک پر یہی نام چسپاں ہو گیا اور اس طرح یہ تحریک "تحریک پاکستان" بن گئی۔

اس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز "پاکستان" ایک اسلامی مملکت ہو گا جس میں اسلام کا قانون جاری ہو گا اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اسی لیے ان کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔ مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر خود قائداعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآن ہو گا۔

اس مرحلے پر یہ بتانا میں نے اپنا فرض سمجھا کہ ایک اسلامی ریاست کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے کس قسم کے رہنما اور کارکن درکار ہوتے ہیں؟ اس کو قائم کرنے کی تحریک کس طرح برپا ہوتی ہے اور اس کے لیے کام کرنے والی جماعت کے اوصاف کیا ہوتے ہیں؟ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک میں مسلسل اس موضوع پر مضامین لکھتا رہا، جن کا مجموعہ **مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش**، حصہ سوم کے نام سے اسی زمانے میں شائع ہو گیا تھا اور اب وہ **تحریک آزادی ہند اور مسلمان**، حصہ دوم کے نام سے ازسرنو شائع کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ میں یہ سمجھتا تھا کہ ان مضامین اور کتاب سے اس تحریک کا رخ نہ بدل سکے گا، جو پوری قوت سے ملک کے گوشے گوشے میں چل رہی تھی، لیکن چونکہ میں علیٰ وجہ البصیرت یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس طرز کی تحریک کے نتیجے میں قومی ریاست تو بن سکتی ہے اسلامی ریاست نہیں بن سکتی، اس لیے میں نے بروقت اپنی بے لاگ رائے پیش کر دینا اپنا فرض سمجھا، قطع نظر اس سے کہ میری رائے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے (**تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی**، ص ۳-۷)۔

ایک ہی بات 'ایک ہی واقعہ 'ایک ہی خبر کو
ہر ایک اپنی نظر سے دیکھتا ہے'
آپ مومن کی نظر سے دیکھیے

آپ کے رویے 'آپ کے اعمال 'آپ کی زندگی
اس سے تشکیل پاتی ہے کہ آپ
پیش آنے والے واقعات اور علم میں آنے والی باتوں کو
کس نظر سے دیکھتے ہیں ؟
مومن کی نظر سے یا غیر مومن کی نظر سے !

مومن کی نظر سے دیکھیے تو :
یہ دنیا آخرت کے لیے ہے
پس آخرت کو کبھی نہ بھولیے!
اللہ کی رضا کے حصول کو
اپنی روزمرہ زندگی کا ہر وقت کا مسئلہ بنالیجیے
اپنے تمام معاملات کو' ملنے جلنے کو'لین دین کو'کام کاج کو' ووٹ دینے کو
اسی نظر سے دیکھیے (صرف نمازوں کو نہیں)
یہ نظر پیدا کرنے کے لیے
قرآن پاک اور سیرت پاکؐ کا مطالعہ' ذرا ڈوب کر' کیجیے۔

(خیر خواہ)

ایمان اور برکت

سید قطب شہیدؒ

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (الاعراف ۷:۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر انھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انھیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

یہ اللہ کی سنت جاریہ کا ایک دوسرا پہلو ہے کہ اگر بستیوں کے لوگ جھٹلانے کے بجائے مان لیتے اور بدکرداری کے بجائے تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا اور بلاحساب ان کو دیتا رہتا۔ آسمانوں سے اور زمین سے ان پر برکات کی بارش ہوتی۔ قرآن نے جو انداز تعبیر اختیار کیا ہے، اس کے پیش نظر ہم اسے ہر طرح کی فراوانی سے تعبیر کر سکتے ہیں جو کسی ایک جنس ضرورت کے ساتھ خاص نہیں ہے، یعنی ہر قسم اور ہر نوع کی فراوانی۔

اس آیت میں ہم پر ایک عظیم حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اس حقیقت کا تعلق بہ یک وقت انسانی نظریات اور انسانی زندگی کے حقائق سے بھی ہے اور اس پوری کائنات کے حقائق سے بھی۔ اس کے اندر انسانی تاریخ کا اہم عنصر اور عامل بھی بیان کیا گیا ہے۔ دنیا کے انسانوں کے وضع کردہ نظام ہاے حیات نے اس اہم عنصر کو مکمل طور پر نظرانداز کیا ہے بلکہ اس کا انکار کیا ہے۔

وہ عنصر ہے اللہ پر ایمان اور اس سے تقویٰ۔ یہ عنصر انسانی زندگی کے حقائق سے جدا چیز نہیں ہے اور نہ انسانی تاریخ سے بلکہ ایمان باللہ اور تقویٰ وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی برکات نازل فرماتے ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اور اللہ سے زیادہ ایفاے عہد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ہم لوگ جو اللہ پر ایمان لانے والے ہیں، ہمارا شیوہ تو یہ ہے کہ اللہ کے اس عہد کو تسلیم کرتے ہیں،

اس کی تصدیق کرتے ہیں' اس کے اسباب و علل کو سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے' اور اس آیت کے مفہوم و مدعا کی تصدیق میں لمحہ بھر تردد بھی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ہمارا ایمان تو ہے ہی ایمان بالغیب۔ اس ایمان کے تقاضے کے طور پر ہم اللہ کے اس عہد کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس کے بعد' ہم اللہ کے اس عہد پر غور و فکر کرتے ہیں کیونکہ اللہ نے خود حکم دیا ہے کہ تم قرآن میں غور و فکر کرو اور غور و فکر کے بعد ہمیں اس بات کی ماہیت و حقیقت کا علم بھی ہو جاتا ہے۔

اللہ پر ایمان لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی فطرت زندہ ہے اور فطری حقائق کے ادراک اور قبول کرنے کی اہلیت اس میں موجود ہے۔ ایسے شخص کا ادراک سچا ہے اور اس کی انسانی بنیاد صحیح و سالم ہے اور اس شخص کے ذہن میں اس قدر وسعت ہے کہ وہ اس کائنات کے حقائق کا ادراک کر سکے۔ یہ تمام امور عملی زندگی میں انسان کی کامیابی کے ضامن ہیں۔

اللہ پر ایمان ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو آگے بڑھاتی ہے۔ یہ انسانی شخصیت کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے انھیں ایک جہت اور رخ پر ڈال دیتی ہے۔ انسانی شخصیت اللہ کی قوت کی مدد سے اس جہت میں آگے بڑھتی ہے۔ اس زمین پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور کرۂ ارض کی تعمیر میں لگ جاتی ہے۔ نتیجتاً اس کرۂ ارض سے فتنہ و فساد کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور انسان زمین کی تعمیر و ترقی میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح کا انسان عملی زندگی میں کامیاب رہتا ہے۔

اللہ پر پختہ ایمان انسان کو اپنی خواہشات کی غلامی اور دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری تمام غلامیوں سے آزاد صرف اللہ کا غلام انسان ہی اس کرۂ ارض پر خلافت راشدہ کا صحیح نظام قائم کر سکتا ہے۔ ایسا شخص ان لوگوں سے قوی تر ہو گا جو ایک دوسرے کے غلام ہیں یا اپنی خواہشات کے غلام ہیں۔

خدا کا خوف ایک دانش مندانہ بیداری ہے۔ اس سے انسان سرکشی' غرور' بے راہ روی جیسے اخلاقی عیوب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کی سرگرمیاں اعتدال اختیار کر لیتی ہیں اور اس کی زندگی کا اسلوب سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی پوری جدوجہد محتاط ہو جاتی ہے۔ وہ سرکشی کا ارتکاب کر کے اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھتا اور اپنی زندگی کو صالحانہ حدود میں رکھتا ہے۔

ایک صالح انسان کی زندگی توازن اور اعتدال پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ قدم آگے بڑھانے اور پیش آنے والی رکاوٹوں کے درمیان توازن پیدا کر لیتا ہے۔ وہ زمین پر محنت کرتا ہے اور آسمان کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ ہوائے نفس' سرکشی اور حق تلفی سے پاک ہوتا ہے اور اس کے دل میں ہر وقت خوف خدا ہوتا ہے۔ ایسا شخص ایک صالح' نتیجہ خیز اور مفید کردار کا مالک ہوتا ہے اور ایسا ہی شخص اللہ کی امداد کا

مستحق ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے اوپر برکات الٰہی کے سائے نزول کرتے ہیں۔ اس کے کام میں خیرو برکت ہوتی ہے اور اس کی زندگی پر فلاح سایہ فگن ہوتی ہے۔ اس کی زندگی بظاہر اسباب کے مطابق چل رہی ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایک غیبی قوت اس کی مددگار ہوتی ہے۔

وہ برکات جو مومنین اور اہل تقویٰ پر سایہ فگن ہوتی ہیں وہ مختلف النوع ہوتی ہیں۔ اس آیت میں ان کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں لیکن وہ یقیناً موجود ہوتی ہیں۔ اس آیت میں جو اشارات ہیں ان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان پر ہر جانب سے برکات کا نزول ہو رہا ہوتا ہے۔ ہر طرف سے برکت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس سے مراد ہر قسم و نوع کی برکات ہیں۔ ہر شکل و صورت میں ان کا نزول ہوتا ہے۔ بعض ایسی ہیں جو لوگوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو وہ سمجھتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ پر ایمان لانا اور اللہ سے تقویٰ کرنا، محض نجی مسئلہ ہے اور اس کا انسان کی عملی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، ایسے لوگوں نے دراصل ایمان کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ وہ دیکھیں کہ اللہ کے نزدیک تو ایمان کا عملی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق موجود ہے، اور اس پر خود اللہ گواہی دے رہا ہے، اور اللہ کی شہادت کافی شہادت ہے۔ اور اللہ اسے ان باتوں سے متعلق کرتا ہے جن کے بارے میں لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ عملی اور اجتماعی زندگی کے معاملات ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں: "ہم مسلمان ہیں اور ہمارے اوپر رزق کے دروازے بند ہیں اور ہمارے حصے میں خشک سالی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ اقوام ایسی ہیں جو نہ مومن باللہ ہیں اور نہ اہل تقویٰ میں سے ہیں لیکن ان پر ہر طرف سے رزق کی بارش ہو رہی ہے۔ ان کے پاس بے پناہ قوت ہے اور وہ دنیا میں بااثر ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں جس سنت الٰہیہ کا ذکر ہوا ہے وہ ہم پر صادق کیوں نہیں آتی؟"

دراصل ایسے لوگوں نے اس مسئلے کے صرف ظاہری اور سطحی پہلو کو لیا ہے۔ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، وہ مومن اور متقی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے، نہ ان لوگوں نے خالصتاً اللہ کی بندگی اور غلامی کا رویہ اپنایا ہے۔ ان کی عملی زندگی میں لا الٰہ الا اللہ کی شہادت موجود نہیں ہے بلکہ یہ لوگ اپنے میں سے بعض غلاموں کی غلامی کر رہے ہیں۔ "یہ" غلام ان کے الٰہ بنے ہوئے ہیں اور ان کے لیے قانون بناتے ہیں اور نہ صرف قوانین بناتے ہیں بلکہ ان کے لیے حسن و قبح کی اقدار بھی تجویز کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ایسے لوگ کہاں مومن ہیں۔ مومن کا تو فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو ختم کر دے جو ان پر مقتدر اعلیٰ بنے ہوئے ہیں۔ مومن کا تو پہلا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو بھی الٰہ و رب نہ بنائے جو ان پر اپنے قوانین اور اپنا نظام نافذ کرے۔ جب ایسے مدعیان کے اسلاف حقیقی مومن اور مسلم تھے تو

ان کے سامنے پوری دنیا سرنگوں تھی' ان پر آسمان و زمین کی برکات کی بارش ہوتی تھی' اور ان کے ساتھ ان کے رب کا وعدہ سچا تھا' کیونکہ وہ خود سچے تھے۔

رہے وہ لوگ جن پر رزق کے دروازے کھول دیے گئے ہیں' تو یہ بھی سنت الٰہیہ کا ایک حصہ ہے۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَ نَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ (الاعراف ۷:۹۵) "پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے ہی رہے ہیں"۔ ان لوگوں پر جو انعامات ہوتے ہیں وہ دراصل ان کے لیے ابتلا و آزمایش ہے' اور یہ ابتلا' مصیبت کی ابتلا سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ کفار پر جو انعامات ہوتے ہیں اور اہل ایمان پر جو انعامات ہوتے ہیں' ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ برکت الٰہی بعض اوقات ایک قلیل چیز میں بھی اپنے رنگ دکھاتی ہے۔ جب انسان ایک تھوڑی چیز سے اچھی طرح فائدہ اٹھاتا ہے اور امن و سکون کے ساتھ خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ دوسری جانب بڑی بڑی ترقی یافتہ اور مال دار اقوام ایسی ہیں جو پریشانی اور عدم اطمینان کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ بظاہر وہ نہایت ہی امن و امان سے زندگی بسر کرتی ہیں مگر ان کے افراد کے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں ہے' افراد معاشرہ کے درمیان بے چینی کا دور دورہ ہے' اور قریب ہے کہ یہ اقوام مکمل طور پر تباہ ہو جائیں۔ سازوسامان بسیار مگر اطمینان مفقود ہے۔ ہر چیز کی فراوانی ہے' لیکن لوگ بدکردار ہیں۔ ان کی خوش حالی ہی ان کے برے مستقبل کا پتا دے رہی ہے' یہ خوش حالی ان کے لیے انتقام الٰہی کا سبب ہے۔

اہل ایمان کو جو برکات ملتی ہیں' ان کے کئی رنگ ہیں۔ ان کی ضروریات کی چیزوں میں برکت ہوتی ہے' ذات انسانی میں برکت ہوتی ہے' انسانی شعور میں برکت ہوتی ہے' پاکیزہ زندگیوں میں برکت ہوتی ہے' اور ان برکات کے نتیجے میں زندگی بڑھتی ہے اور اس کے اندر سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہر طرف سہولیات تو وافر ہوں اور انسان جسمانی اور نفسیاتی پریشانیوں میں مبتلا ہو (**فی ظلال القرآن**' ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی' جلد سوم' ص ۱۷-۲۰)۔

مستقبل کا منظرنامہ

پروفیسر عبدالمغنی ٥

مسیحی کیلنڈر کے مطابق' شمسی تقویم کے حساب سے' ہم بیسویں صدی کے آخری سال میں ہیں' جس کے خاتمے پر اکیسویں صدی عیسوی کا پہلا سال ہمارا منتظر ہو گا۔ اس لیے ابھی سے ہمیں سوچنا ہے کہ آنے والی صدی کا خیر مقدم کس طرح کریں۔ بجائے خود یہ ایک لمحہ فکریہ ہے کہ ہم اپنے کاروبار زندگی میں عیسوی اور شمسی کیلنڈر کے حساب ماہ و سال کی پیروی کر رہے ہیں' اس لیے کہ سترھویں صدی کے سائنسی اور اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلابات کے بعد انیسویں صدی میں اہل علم کی سیاسی و معاشی بالادستی ختم ہو چکی اور بیسویں صدی میں ہم ایک دور زوال سے گزرتے رہے' جب کہ ساتویں صدی سے سترھویں صدی عیسوی تک پورے ایک ہزار سال اہل اسلام نے دنیا کی قیادت کی اور مسیحی دنیا کو عہد وسطیٰ کی تاریکی سے دور جدید کی روشنی میں لائے:

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ (آل عمرٰن ۳:۱۴۰)

یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔

گردش ایام قانون قدرت ہے اور ہمارے لیے سامان عبرت۔ لہٰذا آنے والی صدی کا' خواہ وہ کسی معنی میں ہو' سب سے پہلا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنے زمانے کی صورت حال کو بدلنے کا منصوبہ بنائیں اور تہیہ کریں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ گزرتی ہوئی بیسویں صدی کا ایک تنقیدی جائزہ' اصول فطرت کے مطابق' آفاقی سطح پر لیا جائے' تاکہ ہم طے کر سکیں کہ بیسویں صدی کے ساحل سے انسانی قدروں کا کون سا اثاثہ لے کر' ہم اکیسویں صدی کے ساحل پر پہنچیں اور دو ہزار عیسوی کے بعد تیسرے ہزار میں ہمارا نشانۂ عمل کیا ہو؟

---

٥ سابق وائس چانسلر' ایل این متھلا یونی ورسٹی' دربھنگا' بہار (بھارت)

بیسویں صدی

بیسویں صدی میں مسیحی مغرب اپنے مادی ارتقا کے نقطہ عروج تک پہنچ گیا' جب کہ اسلامی مشرق زوال کی انتہا تک۔ تاریخ میں جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک رنگ اپنی حدوں کو پہنچ جاتا ہے تو قانون فطرت ردعمل کی تحریک کرتا ہے اور دوسرے رنگ کی شروعات ہو جاتی ہیں۔ تبدیلی کے آثار مادی اور اجتماعی دائروں میں رونما ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کا ماحول ہے' لیکن افراد ہر دور میں روحانی اور اخلاقی عوامل کے تحت اپنا وہ کام کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں بالآخر تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ بقول اقبال وقت کا "تار حریر دو رنگ" ہے۔ سلسلہ روز و شب اسی طرح چلتا ہے۔ فطرت الٰہی اپنے معیار پر قوموں کو بھی پرکھتی ہے' افراد کو بھی۔

جوہری توانائی سے خلائی پرواز تک حکیمانہ انکشافات و ایجادات کی فتوحات کا ایک سلسلہ ہے جو بیسویں صدی میں مغربی طاقتوں کے ہاتھوں روپذیر ہوا۔ یہ سطح سمندر پر موج زن حالات کا بالائی دھارا ہے لیکن تہوں میں ایک زیریں دھارا بھی آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ انسان کی مادی ترقی آلات و اوزار کی بنا پر حیرت انگیز ہے اور ابھی حیرتوں کے مزید پہاڑ ٹوٹ سکتے ہیں۔ طلسم ہوش ربا قدیم زمانے میں افسانوں تک محدود تھا' جیسا عام کتابوں کی معلومات سے پتا چلتا ہے' لیکن اب وہ ایک ٹھوس حقیقت نظر آتا ہے۔ گرچہ ترقی علم کی برقی رو کا سراغ آخری کتاب اللہ (قرآن مجید) کے بعض بیانات و اشارات میں ماقبل مسیح کے سلیمان علیہ السلام کے دربار اور ساتویں صدی عیسوی کے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج میں سدرۃ المنتھٰی (سورہ النجم' پارہ ۲۷) سے بھی ملتا ہے' مگر اس عروج آدم خاکی کی علمی تشریح اور عمومی تکمیل ابھی باقی ہے۔ سائنس نے آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز تو ایجاد کرلیا ہے' مگر روشنی یا بجلی کی رفتار سے چلنے والا جہاز' واقعہ معراج کی احادیث کے مطابق براق اور رَفرف کی شکل میں' ہنوز زیر فکر یا زیر تحقیق ہے۔ اسی طرح سلیمانی دور کی جسمانی ترسیل (physical transmission) ہنوز فقط ایک خواب و خیال ہے۔

تخیلات سے قطع نظر' ممکنات کی دنیا میں مادہ پرستی اپنے تمام مضمرات و اثرات کے ساتھ رائج اور غالب ہے۔ موجودہ زندگی میں فیصلہ ممکنات کے معرکہ و میدان میں ہوگا۔ البتہ ممکنات کا رخ کوئی اخلاقی قوت یا نظریاتی طاقت متعین کر سکتی ہے۔ لیکن یہ قوت و طاقت ابھی لٹریچر کے صفحات میں ہے۔ سیاست وقت پر اس کا بہت تھوڑا اثر پڑا ہے اور عوام الناس کا ذہن عمومی طور پر اس کے لیے ہموار نہیں ہوا ہے۔ عمل کے دائرے میں دین و دانش دونوں کم زور ہیں' اس لیے کہ کافراداؤں کی پُرزور حکمت عملی اپنا طلسم پورے عالم پر' مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک' قائم کیے ہوئے ہے۔ بقول اقبال ؎

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

یہ تناظر ہے احوال و حقائق کا' جس کو مدنظر رکھ کر واقعات کا تجزیہ کر کے کوئی نتیجہ نکالنا چاہیے' تاکہ بات دعاؤں اور دعوؤں سے بڑھ کر حقیقتوں اور دلیلوں تک پہنچ سکے۔

بیسویں صدی کے غیر اسلامی مغرب --- یورپ اور امریکہ--- نے مختلف علوم و فنون (arts and sciences) میں اس حد تک ترقیات حاصل کیں کہ علم اور فن بقول سی پی اسنو (C.P. Snow) دو متوازی اور متضاد دائرے بن گئے۔ اس طرح ایک غیر متوازن ترقی نے انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے سماج میں انتشار پیدا کیا۔ مادہ پرستانہ فکر یہی کر سکتی تھی' اس لیے کہ اس کے پاس شیرازہ بندی کرنے والا نکتہ توحید نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹکنالوجی نے خالص قوم پرستانہ تجارتی مفادات اور اجارہ دارانہ سیاسی عزائم کے تحت یورپ اور امریکہ کے اندر دو عظیم جنگیں علی الترتیب اوائل (۱۸-۱۹۱۴ء) اور وسط صدی (۴۵-۱۹۳۹ء) میں برپا کر کے مہلک ترین اسلحوں سے عالم انسانیت کی تباہی کا سامان کیا۔ اس کا اثر مغربی یا مسیحی معاشرت پر ایسا سخت پڑا کہ سارے اقدار و اخلاق غارت ہو گئے' زندگی کا کوئی فلاحی نصب العین باقی نہیں رہا۔ سرمایے کے بل پر دنیا ہی کو جنت بنانے کی ہوس نے روے زمین پر آتش جہنم کے دہانے کھول دیے۔ پھر مذکورہ جنگوں کے بعد باقی آدھی صدی قیام امن کے لیے' ستم ظریفی یہ ہے کہ' پہلے سے بھی بدرجہا زیادہ مہلک اسلحے تیار کرنے میں گزری۔ چنانچہ اس وقت پوری متمدن کہلانے والی دنیا بڑی بہادری کے ساتھ بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی دادعیش دے رہی ہے۔ سرمایہ داری کے ردعمل میں جو اشتراکیت برسرکار آئی وہ معاشی مسئلہ حل کرنے میں بھی' حالاں کہ وہی اس کا مطمح نظر تھا' بری طرح ناکام ہوئی۔ اس کے علاوہ سوویت روس اسلحے کی دوڑ میں سرمایہ دارانہ جمہوریتوں سے بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا' یہاں تک کہ مغربی یورپ و امریکہ اور مشرقی یورپ و روس کے درمیان فقط ایک دہشت کا توازن (balance of terror) بقول برٹرنڈرسل قیام امن یا وقفہ امن کا باعث و ضامن ہوا۔ لیکن دو بڑی طاقتوں کی یہ سرد جنگ اشتراکی روس کے خاتمے اور اشتراکی چین کے ارتداد کے بعد اب ختم ہو گئی ہے' گرچہ بارود کے ڈھیر اب بھی آتش فشاں کی طرح سلگ رہے ہیں۔ انسانیت کی نئی نسل اس صورت حال سے بالکل مایوس و مضطرب ہو کر ایک قطعاً منفی رخ پر گویا خودکشی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اسلامی مشرق انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے اولاً مغربی استعمار (colonisation) اور سامراج (imperialism) کے خلاف' دوم معاشرتی اصلاح اور سیاسی و تہذیبی انقلاب کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ جمال الدین افغانی ایک پیام تجدید لے کر ہندستان سے مصر تک چلے

گئے۔ ان کے ساتھ اور کچھ بعد صرف غیر منقسم ہندستان میں شبلی نعمانیؒ ' ابوالکلام آزادؒ ' علامہ اقبالؒ اور ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اتنا عظیم الشان لٹریچر تصنیف کیا کہ بالآخر ایک ہمہ جہتی آفاقی تحریک پیدا ہو گئی اور آخر الذکر کی کوششوں سے ایک زبردست تنظیم کی صورت اختیار کر گئی۔ برعظیم کی تحریک آزادی نے برطانیہ کی غلامی سے رہائی کے باوجود اندرونی اور بیرونی سیاست وقت کی ریشہ دوانیوں کے سبب ایسی پیچیدگی پیدا کر دی کہ آج تک اس خطے میں امن قائم نہیں ہوا۔ یہ بدامنی بہرحال آج کا رنگ زمانہ ہے اور کوئی خطہ زمین اس سے بری نہیں۔ موجودہ دور بین الاقوامی ہے اور برق رفتار وسائل نشرواشاعت نے معاملات و مسائل کی آفاقی جہت کو نمایاں کر دیا ہے۔ لہٰذا اکیسویں صدی کے منظرنامے میں بہتر رنگ بھرنے کے لیے اس جہت کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ یہ ایک مثالی مقصود ہے' جس تک پہنچنے کے لیے ایک واقعاتی نقشہ عمل اور نشانۂ کار مرتب کرنا ضروری ہے۔

اکیسویں صدی میں

اکیسویں صدی' بیسویں صدی کی وارث ہے اور اپنے ورثے سے منہ نہیں موڑ سکتی' تاوقتیکہ حالات کا رخ کسی عالم گیر انقلاب کے تحت بالکل بدل نہ جائے۔ جو مسائل آنے والی صدی کو گزرنے والی صدی سے ورثے میں لازماً ملیں گے اور روز بہ روز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو کر آخری حد تک پہنچ جائیں گے وہ حسب ذیل ہیں:

۱- **جنسی مسئلہ** : سب سے نازک اور پرخطر مسئلہ مرد اور عورت کے فطری رشتے کا عدم توازن ہے' جس نے مادی طور پر ترقی یافتہ یورپ اور امریکہ کے مہذب کہلانے والے تمدن کو برہم کر دیا ہے' یہاں تک کہ مغرب کا خاندانی نظام پارہ پارہ (atomise) ہو کر رہ گیا ہے۔ ماں باپ' شوہر بیوی' بھائی بہن اور بیٹا بیٹی کے رشتوں کا تقدس باقی نہیں رہ گیا ہے۔ سائنس اور صنعت کی غلط روی نے فطرت انسانی کو اس حد تک مسخ کر دیا ہے کہ عورت صرف عورت کی حیثیت سے مرد کی برابری ہی نہیں' اس پر برتری حاصل کرنا چاہتی ہے۔

فرائڈ کے فلسفہ جنس نے ہوس (libido) کے ہاتھوں مذکر و موئث کی ترتیب گویا الٹ کر رکھ دی ہے۔ اب مرد کے بجائے عورت "قوام" (سربراہ خاندان) بن کر پرانے' فرسودہ و بوسیدہ مادری نظام (matriarchal system) کی قابلیت کو روبہ عمل لانا چاہتی ہے۔ مخلوط معاشرے کے سبب مرد اپنا جنسی داعیہ (sexual urge) کھوتے جا رہے ہیں۔ سمعی و بصری ذرائع کی بدعنوان ترویج نے ہر گھر کو سینما ہاؤس بنا دیا ہے۔ فحش رقص و موسیقی نے طبیعتوں کو متاثر کر کے جنس کے فطری تقاضے کو مصنوعی طور پر مشتعل بھی کیا ہے اور اس کا نفسیاتی ترفع (sublimation) بھی۔ نتیجتاً مرد و عورت دونوں کی جنس مسخ

(pervert) ہو گئی ہے اور ناجائز تعلق مغربی اور اس کے مقلد مشرقی تمدن میں بھی نہ صرف جائز بلکہ مرغوب و محبوب ہو گیا ہے۔ عورت گھر کی چار دیواری سے حیا کی چادر پھینک کر بازار و کاروبار کی قاتل ہواؤں کی زد پر آگئی ہے۔ چنانچہ نئی نسل آغوش مادر اور نگاہ پدر دونوں سے محروم ہو کر آوارہ گرد ہوتی جا رہی ہے۔ آنے والی صدی کا یہ سب سے بڑا ہائیڈروجن بم ہے جس کا انفجار (explosion) انسانیت کے پرزے اڑا دے گا۔ خاندانی منصوبہ بندی کی لعنت ابھی سے انسانیت کے مستقبل کو تاریک بنا رہی ہے۔ مرد و زن کے اعضاے جنس کے سارے آپریشن یکسر وحشیانہ ہیں۔ اس سلسلے میں مغربی طب کی تمام ترقیات معکوس ہیں۔ تہذیب مغرب نے نسوانیت کی انتہائی توہین کر کے گویا قدیم بردہ فروشی کا بازار گرم کر دیا ہے۔ یہ رجعت قہقری (reversion) آدمیت کو فنا کرنے کا سامان ہے۔

۲- **معاشی مسئلہ** : سرمایہ پرستی (capitalism) نے صنعتی انقلاب کے زمانے' اٹھارہویں صدی' سے ہی مغرب کے ماحول کو ہر جہت سے مسموم کرنا شروع کر دیا' اس لیے کہ برق و بخارات (electricity and steam) کی غیر متوازن مادہ پرستانہ ترقی نے عدل اجتماعی (social justice) اور ماحولیات (ecology) دونوں کے فطری و انسانی تقاضوں کو نظرانداز کیا۔ عقلی دور (age of reason)' اس کے بعد سائنسی دور (age of science) اور سب کے اوپر تکنیکی دور (age of technology) نے پیہم ذہن و کردار کو چند دولت مند افراد کی عیاشی (luxury) کی طرف موڑ دیا' جب کہ بڑھتا ہوا افلاس عوام کا مقدر بن گیا۔

کارل مارکس نے جرمنی سے انگلستان کے گہوارۂ صنعت میں آکر اس رجحان زمانہ کے خلاف سوشلزم کا فلسفہ پیش کیا۔ یہ ردعمل انتہاپسندانہ تھا۔ لینن اور اس کے شاگرد رشید اسٹالن نے اس فلسفے کو روس میں کمیونزم کی وہ آمرانہ شکل دے دی جس نے عوام کا نام لے کر عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے۔ یہ دراصل سیاست بازوں کی دفتر شاہی کا عروج تھا۔ اس نے ایک نیا سامراج مشرقی یورپ سے چین تک قائم کیا۔ کمیونزم کے تحت وسائل کی ریاستی اجارہ داری (state monopoly) نے کیپٹلزم کے تحت انفرادی اجارہ داری سے بڑھ کر ناانصافیاں کیں۔ اشتراکیت نتیجتاً معاش کا وہ مسئلہ حل کرنے میں قطعاً ناکام ہوئی جو اس کی واحد نظریاتی بنیاد تھی۔ چنانچہ سوویت روس پون صدی کے اندر بکھر گیا' گرچہ روس کی پرانی زارشاہی اب بھی ایک نئی شکل میں جور و جفا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔ افغانستان سے ذلیل ہو کر نکالے جانے کے بعد اب یہ چیچنیا (کوہ قاف) کے حسین علاقے کو تباہ کر رہی ہے۔

اس طرح کیا سرمایہ داری' کیا اشتراکیت دونوں نے اپنی اپنی جگہ انسان کے معاشی مسئلے کو حد درجہ الجھا دیا ہے۔ یہ الجھن اکیسویں صدی میں اور زیادہ بڑھے گی' اس لیے کہ اشتراکی اجارہ داری اور آمرانہ دفتر

شاہی پر بے روک اور بے لگام سرمایہ پرستی اور نفع اندوزی کا غلبہ' جس کے آثار پوری دنیا میں نمایاں ہیں' چور بازاری کرنے والے بلیوں کا اقتدار معاشی میدان میں حد سے زیادہ بڑھا دے گا۔ اس طرح ہوس پرست سرمایہ دار لوگوں اور قوموں کی تقدیر کے مالک بن کر سماج کا دیوالیہ نکال دیں گے۔ حکومت وقت ان کی محتاج ہو گی اور ان کے ظالمانہ اشارے پر چلے گی۔ انسانی اقدار و اخلاق سے معیشت کا دائرہ خالی ہو جائے گا اور بندگان شکم وحشیوں کی طرح اپنی اپنی قوموں کو لوٹیں گے' پھر ان کے خالص تجارتی مفادات ایک تیسری اور اب تک کی مہلک ترین جنگ عظیم کا سامان کریں گے' جس میں مغرب و مشرق نیز جنوب و شمال کی تمیز ختم ہو جائے گی۔ مترفین (خوش حال لوگ) یہ جنگ عام مفلسوں پر عذاب کی طرح نازل کر کے بالآخر آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے۔ اس آفاقی تباہی سے بچاؤ کی صورت دبے اور کچلے ہوئے لوگوں (مستضعفین) کا کسی بڑے نظریے کے تحت اتحاد اور زر پرستوں سے حق پرستانہ جہاد ہے۔

۳- **سیاسی مسئلہ**: شہنشاہی اور جاگیرداری کے بعد مغرب کے مفکروں نے جمہوریت کا وہ نقشہ پیش کیا جو آج پوری دنیا کا عقیدہ ہے۔ برطانیہ کی پارلیمانی جمہوریت اور امریکہ کی صدارتی جمہوریت کے دو سیاسی نمونے جدید تمدن کی بساط اقتدار پر رونما ہوئے۔ انھی نمونوں کو سامنے رکھ کر یا ان کے عناصر کو ملا جلا کر ایشیا و افریقہ میں مغربی انداز کی جمہوریتیں قائم ہوئیں۔ اشتراکی روس اور چین نے رنگ زمانہ کو دیکھ کر پُرفریب عوامی جمہوریت (people's democracy) کا نعرہ لگایا۔ یہ ایک کھوکھلی نقالی ہے' جس کی روح درحقیقت اشتراکی آمریت (dictatorship of the proleteriat) ہے۔ استبداد اور دفتری اجارہ داری اس کا نشان ہے۔ برطانوی اور امریکی جمہوریت بھی پارٹی بندی یا گروہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں اقتدار برائے اقتدار اور مخالفت برائے مخالفت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عدل اجتماعی کا تصور بھی معدوم ہے۔ اکثریت اور اقلیت' جو محض تعداد پر مبنی ہوتی ہے' کسی ضابطے پر کاربند نہیں ہوتی۔ ۵۱ جو چاہیں کریں' ۴۹ کا کوئی وزن نہیں ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس عددی جمہوریت میں تعداد کا استبداد ہے' عام حریت اور عوامی آزادی نہیں۔ پھر جمہوری حربے وہی ہیں جو شاہی حربے ہوا کرتے تھے ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پاے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

بیسویں صدی کی پامال کردہ یہ سیاست وقت اکیسویں صدی میں دیر تک جاری نہ رہ سکے گی اور اس کی

شمع بالآخر بھڑک کر کسی وقت بجھ جائے گی۔ اس کے بعد جو سیاسی تاریکی چھائے گی۔ ممکن ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے قومی فسطائیت یا فوجی نازیت کے ہول ناک فانوس اسی طرح جلائے جائیں جس طرح بیسویں صدی کے تقریباً وسط میں اٹلی اور جرمنی میں روشن ہوئے تھے۔ روسی استبداد کی رجعت بھی اس کے خاص خطے میں متوقع ہے۔ لیکن یہ شاید ایک عارضی بھڑک ہو' جس کے نتیجے میں دنیا کو جمہوریت' فسطائیت اور آمریت کے بہتر بدل کی تلاش ہو گی۔ آنے والے دنوں میں سیاسی سطح پر امریکی قوم پرستی ایک عالمی فتنہ بن سکتی ہے۔ روس کی علاقائیت بھی کم فتنہ انگیز نہیں۔ یورپ میں جرمنی ایک بار پھر دنیا کے لیے چیلنج بن سکتا ہے۔ چین اور جاپان کسی فتنے کے اتحادی بھی ہو سکتے ہیں اور بجائے خود علاقائی فتنے بھی بن سکتے ہیں۔ ہندستان میں کوئی سیاسی کش مکش ہو سکتی ہے۔ مغربی ایشیا میں ایران اور مشرق وسطی میں اسرائیل کوئی بھی غیر معمولی سیاسی اقدام کر سکتے ہیں۔

۴- **مذہب و معاشرت**: جنس' معیشت اور سیاست سماج کے اوپری ڈھانچے ہیں۔ ان کی بنیاد میں ایک طرف مذہبی عقیدہ ہوتا ہے' دوسری طرف معاشرتی اقدار۔ دراصل عقیدہ ہی اقدار ترتیب دیتا ہے۔ لیکن بسااوقات عقیدہ و اقدار میں انحراف کی صورت پیدا ہوتی ہے' جس سے مذہب و معاشرت دونوں مجروح ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی میں ایسا ہی ہوا۔ اس کا سبب مشرق پر مغرب کا سیاسی استبداد اور معاشی جبر ہے' جس نے تمدن کی تجدید و ترقی کے نام پر تہذیب کو مسخ کر دیا۔ صنعتی آلات نے بقول اقبال احساس مروت کو کچل دیا۔ انسانیت کی قدر صنعت کے مقابلے میں گھٹ گئی۔ سائنس کے مادہ پرستانہ رخ نے فقط تن پروری کو رواج زمانہ بنا دیا۔ یہ بے روح اور بے کردار فیشن پوری دنیا کے معاشرے میں پھیل گیا۔ اس کے چکر میں ذہنی قوت پستیوں کی طرف مائل ہو گئی اور دانش وری کے عنوان سے بے دانشی عام ہو گئی۔

غلام ہندستان میں اردو زبان و ادب کے دین پسند اہل قلم نے لادین سماجی لہر پر روک لگانے کی کوشش کی' جو تحریک کی حد تک شروع ہی میں کامیاب ہوئی' لیکن تنظیم کی نوبت صدی کے وسط تک آئی۔ اس کے باوجود رائے عامہ ہنوز دینی نظریے کے لیے جمہوری سیاسی سطح پر ہموار نہیں ہوئی۔ خود مسلمانوں کے درمیان اسلام پسندی پوری زندگی کا نظریہ و نظام نہیں بن سکی۔ اس کے بجائے روایتی رسم و رواج مذہب ہی کے نام پر جاری رہے۔ اس سے ایک تو اہل مذہب کی بدنامی ہوئی' دوسرے سماجی پستی بڑھتی چلی گئی اور ملی طور پر مسلمانوں کی پسماندگی انتہا تک پہنچ گئی' سیاست میں بھی' معیشت میں بھی۔ صدی کے آخر تک یہی کیفیت ہے۔ ممکن ہے کہ اگر یہ احساس زیاں' اقبال کے لفظوں میں' عام ہو تو متاع کارواں گم شدگی کے بعد بازیاب ہو۔ اقبال اور مودودی رحمہما اللہ کے افکار' ملت اور انسانیت کے لیے اکیسویں صدی کی سب سے بڑی پونجی بن سکتے ہیں۔ سوال اصلاح معاشرہ کے ساتھ ساتھ سیاسی انقلاب کا

بھی ہے۔ بال جبریل کی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" کے آخری بند سے پہلے کے بند میں مغربی مسیحی دنیا کے فکری انقلابات کا ایک جائزہ لینے کے بعد مفکر شاعر کہتا ہے ؂

روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

اس کے بعد زبور عجم کی ایک نظم نما غزل کا ایک شعر اس طرح ختم ہوتا ہے:

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدا یاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

(ترجمہ) سرمایہ دار مزدور کے خون سے سرخ موتی بناتا ہے' اُدھر زمین داروں کے ظلم سے دہقانوں کی کھیتیاں اُجڑ چکی ہیں۔ انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

مطلب یہ ہے کہ ملت اور انسانیت دونوں کو آنے والے زمانے کی حقیقی قیادت کے لیے تجدید و انقلاب کے مرحلوں سے ایک خاص رخ پر گزرنا ہے' جس کی نشان دہی شاعر بانگ درا کی مشہور نظم "شمع اور شاعر" کے اختتام پر پہلے ہی کر چکا تھا ؂

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

اکیسویں صدی کا منظرنامہ

قرینہ غالب ہے کہ اکیسویں صدی کا آفتاب جب روے زمین پر طلوع ہو گا تو ۲۰۰۱ء میں کوئی بڑی طاقت باقی نہیں رہ جائے گی' اس لیے کہ جس امریکہ کا اخلاقی دیوالیہ بے پناہ مادی طاقت کے باوجود پہلے ہی نکل چکا ہے اس کا معاشی دیوالیہ بھی مستقبل قریب میں نکل جائے گا۔ سودی نظام اپنی پالی ہوئی سرمایہ داری کو تدریجی تقلیل نتائج (diminishing return) کے تسلیم شدہ معاشی عمل کے تحت رفتہ رفتہ کھا جائے گا یا دنیا کے بازار میں بالکل ننگا کر کے چھوڑ دے گا۔ اس کے بعد امریکہ کی سیاسی بازی گری اسی طرح مذاق کا ایک موضوع بن جائے گی جس طرح برطانیہ کی سلطنت پر سورج ڈوبنے کے بعد اس کی سامراجی سیاست بن گئی۔ روس اب پنپنے والا نہیں۔ سکڑتے ہوئے اشتراکی سامراج کے دن گنے ہوئے ہیں۔ چینی اژدہا دنیا پر اپنا پھن اٹھائے گا لیکن اسے دیوار چین پر ٹپک کر رہ جائے گا' یا زیادہ سے زیادہ اس کی پھنکار جنوب مشرقی ایشیا میں سنی جائے گی۔ جرمنی یورپ کا قائد بن کر امریکہ کی چودھراہٹ کو مغربی افق پر چیلنج کرے گا۔

جاپان کا معاشی دیو بھی امریکہ ہی سے زور آزمائی کرے گا۔ اسرائیل کی نسلی تنگ نظری اسے خفیہ ریشہ دوانیوں سے آگے نہیں بڑھنے دے گی اور فلسطین یروشلم ہی میں اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائے گا۔

مغرب کی نوآبادیاتی شہنشاہی، رئیسانہ جاگیرداری، ظالمانہ سرمایہ داری، فرعونی اشتراکیت اور آمرانہ فسطائیت و نازیت کی نظریاتی شکست و ریخت کے بعد مشرق تاریخ کے آیندہ دور میں اپنا تعمیری کردار ادا کرنے کے لیے آزاد ہو گا۔ لیکن سوال ہے، کیا ایشیا و افریقہ کسی ایسی نظریاتی بنیاد پر متحد ہو سکیں گے جو یورپ اور امریکہ کی انسانیت کو بھی حریت، اخوت، مساوات اور عدل اجتماعی کا پیغام دے کر پوری دنیا کی متوازن ترقی کے اگلے مرحلے کا سامان کرے اور عروج آدم خاکی کی یہ آخری منزل اپنی جھلک قریب سے دکھانے لگے؟

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا سوال ہے، جس کے صرف اصولی جواب کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تعمیل و تکمیل قدرت الٰہی کے ہاتھوں میں ہے۔ مشیت صرف اشارے کرتی ہے۔ کیا کوئی فراست اس اشارے کو سمجھ سکتی ہے؟ ہے کوئی ایسا مدبر عامل (factor) جس میں عنقریب رونما ہونے والے منظرنامے میں کردار و عمل کی صلابت و جرأت بھی ہو؟

تقدیر امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

مشہور عالم مورخ آرنلڈ، جے، ٹائن بی کے خیال میں صرف اسلام کا تصور توحید آج کی بکھرتی ہوئی انسانیت کی شیرازہ بندی کر سکتا ہے اور جوہری نظریے (nuclear theory) کے خالق جس نظریہ اضافیت (theory of relativity) نے عالمی سماج کو پارہ پارہ کیا ہے وہی نظریہ توحید کے تحت آ کر آفاقی وحدت کا سامان بھی کر سکتا ہے، اس لیے کہ اس نے انیسویں صدی کی سائنس کی مطلق مادہ پرستی کو ریاضیاتی طور پر رد کر دیا ہے (ملاحظہ ہو پیام مشرق، مطبوعہ ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال کا اردو دیباچہ)۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یہ کائنات میں اصول وحدت کا سائنسی سراغ ہو گا، جس سے وحدت اللہ اور وحدت انسانیت دونوں کے مسلم الثبوت تصورات دریافت ہوں گے۔ اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں "خضرراہ" کے اس اہم ترین نکتے پر نظر ڈالنی چاہیے۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

اس نکتے کا اتمام ضرب کلیم کی "شعاع اُمید" کے اس خاتمے پر ہوتا ہے ~

مشرق سے ہو بے زار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اس منظرنامے میں ایک آفاقی جہت سے ملت اسلامیہ یا امت مسلمہ اور عالم انسانیت نہ صرف ایک دوسرے سے ہم آہنگ بلکہ ایک دوسرے کے ہم معنی ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے امت مسلمہ کو امت وسط اور خیرامت اسی معنی میں کہا ہے اور بلاامتیاز فرقہ و طبقہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر کو ملت اسلامیہ کا منصبی فریضہ قرار دے کر اسے پوری دنیا کی اصلاح و فلاح کی جدوجہد پر مامور کر دیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمتہ للعالمین ہیں۔ اس سلسلے میں رائج الوقت قوم پرستی کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے الدین پر گام زن ہونے والی امت مسلمہ کو سب سے آگے بڑھ کر اقدام و عمل کرنا ہو گا۔ اسی طرح ملوکیت کے بجائے خلافت اور عددی جمہوریت کے بجائے اجماعی شورائیت اختیار کرنی ہو گی۔ معاشی نظام کو سود سے پاک کرنا ہو گا اور معاشرت کو عیاشی اور بے حیائی سے۔ یہ مجاہدہ وقت جہاد فی سبیل اللہ کی وسیع ترین شکل ہو گی، جس میں قلم سے تلوار تک استعمال کی جائے گی۔ اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے اور وہ کتاب و سنت کی روشنی میں اجماع امت سے رو بہ عمل آتا رہے گا۔ اس کی شکل پارلیمانی بھی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ طریق انتخاب میں بہتری لا کر اسے حقیقی نمایندگی کا ضامن بنایا جائے۔ مختصر یہ کہ صحیح نظریہ حیات کے ساتھ صالح نظام زندگی کو بھی وسیع ترین پیمانے پر رائج و نافذ کرنا ہو گا۔

اہم اقدامات

اس ہمہ گیر انقلاب کے لیے حسب ذیل نکات کو مدنظر رکھنا ہو گا:

۱- معاشرے کو بدعات و خرافات سے پاک کرنا ہو گا۔ اس کے لیے مسجدوں سے گھروں تک کے نظام کو درست کرنا ہو گا۔ نماز ادا کرنے میں اعتدال سے خطبے میں توازن تک کا انتظام کرنا ہو گا۔ خواتین اور اولاد کو شرعی نظم و ضبط کا پابند بنانا ہو گا۔ ازدواج میں وسعت و سہولت حسب شریعت پیدا کرنی ہو گی۔ قدیم رسوم کو یک قلم ختم کر کے جدید رواجوں کو رد اور بند کرنا ہو گا، تاکہ پورے سماج پر محیط جاہلیت کی تباہ کن غارت گری سے نجات ملے اور ایک بوسیدہ و فرسودہ معاشرے کے بجائے ایک تازہ اور صحیح معنوں میں ترقی یافتہ معاشرہ وجود میں آئے، جو ایک چست، درست، مستعد اور موثر خاندانی نظام پر استوار ہو۔

۲- معیشت کو ملازمت کے چکر سے نکالا جائے۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دیا جائے۔ معاشی نظام رئیسوں کی آمرانہ سود خوری کے بجائے محنت کشوں کی جمہوری شرکت نفع و نقصان پر مبنی ہو۔ سرمایہ و محنت کا یہ باہمی تعاون و اشتراک حقیقی جمہوریت، مساوات اور اخوت کا باعث ہو گا۔ اس طریقے سے ہر طبقے کو یکساں سماجی انصاف ملے گا، ہر فرد کو بلاامتیاز اپنی صلاحیت و مشقت کے مطابق زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔ اس سے ملعون و مہلک طبقاتی کش مکش کے بجائے باہمی مفاہمت کی صورت پیدا ہوگی اور ایک صحت مند و صالح مسابقت معاشرتی فلاح کی ضمانت دے گی۔ اس سے بے جا اور نامنصفانہ تحفظ کی جگہ ایک معقول عادلانہ تناسب سے شہریوں کے ہر حلقے کے فروغ کا سامان ہو گا۔ سب سے بڑھ کر فرد و ملت کا وہ ربط باہمی رونما ہو گا جس کے بغیر کوئی معاشرہ نہ تو قائم ہو سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے۔

۳- معاشرتی و معاشی مقاصد کے حصول کے لیے موجودہ ازکار رفتہ، سراسر ناکام اور بے نتیجہ سیاسی نظام میں تبدیلی ضروری ہے۔ "بالغ رائے دہی" کے ساتھ ساتھ "عاقل رائے دہی" کا بھی بندوبست کرنا ہو گا، خواہ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے ہو یا قواعد وضوابط کے مطابق۔ اس سلسلے میں عوامی نمایندگی کے قانون میں ضروری اور مناسب رد و بدل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ مہم باہمی مشاورت اور اجماع امت سے سرانجام دی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ اللہ کی قانون سازی کے سوا کوئی بھی قانون سازی نہ تو دائمی ہے نہ غیر متبدل۔ اس میں انقلاب ہوتا رہتا ہے اور ہوتے رہنا چاہیے۔

انقلاب اوپر سے نہیں آنا چاہیے، جیسے فوجی آپریشن مارشل لا کے بل پر، بلکہ اسے نیچے سے رائے عامہ کی بنیاد پر ہمواری اور استواری سے لایا جانا چاہیے، تاکہ یہ صحیح معنوں میں شورائی اور اجماعی ہو اور دیرپا ثابت ہو۔ اس سلسلے میں جو طریق نمایندگی اختیار کیا جائے، وہ عوامی اور انتخابی ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی طور پر قابل قبول اور لائق اعتبار ہو، خواہ وہ پارلیمانی یا صدارتی ہو، یا ملا جلا، یا دونوں سے بالکل الگ مگر بہتر۔ قیادت کا معیار لازماً لیاقت و خدمت پر مبنی ہو اور اس کا محرک و مقصود بداہتہً صلاح و فلاح ہو۔ صحیح ترین طرز سیاست و حکومت کا واحد تاریخی و مثالی نمونہ خلافت راشدہ ہے، جس کی کوئی نظیر معلوم تاریخ عالم میں موجود نہیں۔

اکیسویں صدی اور امت مسلمہ

دنیا کی پوری تاریخ میں نظریۂ زندگی اور نظام حیات، جو روز اول سے کائنات اور انسانیت کا نصب العین رہا ہے، صرف اس امت مسلمہ نے پیش کیا ہے جو آفاق میں اللہ کے دین فطرت کی علم بردار رہی ہے۔ خواہ یہ امت عروج و زوال کے قدرتی قانون کے تحت حالات کے جس مرحلے میں رہی ہو، اس کا دین ہمیشہ اپنی جگہ قائم و دائم رہا ہے اور ہر دور میں بالآخر انسانیت کی بگڑی اسی نے بنائی ہے، اس لیے کہ اس

کے سوا کوئی دین زمین و آسمان کے خالق و مالک کے نزدیک مقبول و معتبر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے ہٹ کر پچھلی دو صدیوں میں دنیا نے سیاست و معیشت و معاشرت کے جتنے فلسفوں کو آزمایا اور چلایا، محدود مادی ترقی اور عارضی غلبے کے بعد وہ سب ناکام ہو گئے اور آج تاریخ ایک بار پھر کسی بہتر نظریہ و نظام کا سوال کر رہی ہے۔ یہی اکیسویں صدی کا مسئلہ ہے، جس کا حل صرف اسلام کے پاس ہے، خواہ سب انسان اس دین پر ایمان کا اعلان کریں یا نہ کریں۔ اس دین کے ماننے والوں نے ساتویں سے سترہویں صدی تک پورے ایک ہزار سال دنیا کی قیادت کی ہے اور انسانیت کا متوازن مادی و روحانی ارتقا انھی کے ہاتھوں ہوا ہے، گرچہ ان کی فرماں روائی کے طویل دور میں عیسائی، یہودی، مجوسی، ہندو وغیرہ سبھی مختلف عقیدوں کے ماننے والے حفاظت و عزت کے ساتھ نہ صرف زندہ رہے بلکہ آزادی اور برابری سے ترقی کرتے رہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ اللہ کا قرآنی تصور یہ ہے کہ وہ سارے جہاں کے یکساں پروردگار (رب العٰلمین) اور سارے عالم کے لیے یکساں رحمت (رحمة للعالمین) ہیں۔

اب اکیسویں صدی میں حق و باطل کا وہ معرکہ جو انیسویں اور بیسویں صدی سے چلا آ رہا ہے اپنے آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جائے گا، جس کے بعد یا تو قیامت ہو گی یا اسلام کی نشأت ثانیہ۔ بیسویں صدی کے اواخر کی گہری اور وسیع تاریکی قانون قدرت کے مطابق ایک نئی صبح کی روشنی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصر نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

یہ صداقت ابھی پردے میں ہے اور مسلمان خود عملی طور پر دنیا اور اسلام کے درمیان ایک پردہ بنے ہوئے ہیں۔ لیکن عصر حاضر کے مسائل کا تقاضا یہ ہے کہ پردہ اٹھے اور حقیقت نمودار ہو:

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری　　ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری　　کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یہ قرآن کا وعدہ ہے اور اسے پورا ہو کر رہنا ہے۔ اسلام کائنات کا آفاقی دین ہے۔ اس پر کسی قوم یا فرقے کا اجارہ نہیں۔ یہ انسانیت کی ضرورت ہے۔ جو صالح جماعت قانون قدرت کے مطابق اصلح (fittest) بن کر اٹھے گی وہی نظریۂ اسلام کے مطابق آنے والے دور میں دنیا کا نظام یا اصلی نظام نو (new world order) چلائے گی اور بوسیدہ و فرسودہ مغربی نظام، جس پر امریکہ اور یورپ کی مسیحی دنیا کو

فخر ہے' اپنی موت آپ مرجائے گا۔

ضرورت ہے کہ ملت اسلامیہ ایک بنیادی اور کلی انقلاب (radical and total revolution) کا مطمح نظر سامنے رکھ کر' مقامی و علاقائی کے بجائے عالمی و آفاقی سطح پر اٹھے' خواہ اٹھنے والی کوئی حکومت نہیں' نظریاتی جماعت ہو' اور اس کے وسائل محدود نیز قیادت ابتداً چھوٹی ہو۔ مذہبی و نسلی فرقہ واریت سے صرف نظر کر کے اصولی و عمومی تحریک و تنظیم ہی اس سلسلے میں درکار ہو گی۔ اقبال و مودودی رحمہما اللہ کا تصنیف کیا ہوا تحریکی لٹریچر صرف اردو میں بھی اتنا عظیم الشان ہے کہ ایک کامیاب جدوجہد کے لیے کافی ہے۔ اس کے ترجمے دیگر زبانوں میں جس حد تک کیے جا چکے ہیں' اس سے زیادہ کیے اور پھیلائے جا سکتے ہیں۔ ہمارے ان عظیم ترین مفکروں کے افکار کتاب و سنت پر مبنی ہونے کے سبب اکیسویں صدی کے لیے بھی اتنے ہی اہم اور مفید ہیں جتنے بیسویں صدی کے لیے رہے ہیں۔ ان کی اجتہادی اور تجدیدی کاوشیں آفاقی جہت رکھتی ہیں اور ان کے نتائج عالمی پیمانے پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے' جو ابھی جاری ہے' بہترین دماغ تھے اور ان کے مقابلے کا کوئی دانش ور ہنوز کسی بھی زبان میں نہ تو ابھرا ہے' نہ مستقبل قریب میں اس کے ابھرنے کی امید ہے۔ اقبال کی نظم اور مودودی کی نثر آج کی دنیا کی بہترین نظم و نثر ہے۔ دونوں پر قرآن مجید کے لافانی اعجاز بیان کا پرتو ہے۔

ضروری نہیں کہ سب پڑھنے والے ان خیالات سے پورا اتفاق کریں لیکن جو لوگ بھی متفق ہوں وہ اپنا فرض عملاً ادا کریں' انفرادی طور پر بھی' اجتماعی طور پر بھی۔ اگر ایسا ہو سکا تو توقع ہے کہ اس کام کے اثرات اکیسویں صدی کے اوائل ہی میں ان شاء اللہ نمایاں ہو جائیں گے۔ صحیح فکر کی وسعت اگر عمل کی وسعت بھی اختیار کر لے تو اس کی تاثیر اپنے آپ واضح ہو جائے گی اور اس کی کامیابی میں زیادہ دیر نہیں ہو گی۔

یہ گھڑی محشر کی ہے' تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

---

15 مسائل کا حل کیسے ہو؟

مسائل اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وقت اور دوسرے وسائل ناکافی محسوس ہوتے ہیں۔ ذمہ داران کا شکوہ بجا ہوتا ہے کہ ان کی توانائیوں کا بیشتر حصہ مسائل کو نمٹانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مقاصد کے حصول کے لیے کسی خلل کے بغیر ترجیحات کے مطابق کام کر سکیں۔

مسائل کا دباؤ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ حل کی کوششیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ اہم مسائل کی قیمت پر ہنگامی مسائل پر توجہ رہتی ہے اور سطحی کوششوں کے باعث ایک ہی مسئلہ بار بار اٹھتا ہے--- بالآخر کارکردگی متاثر ہوتی ہے اور چھوٹے مسائل بڑے بحران کا روپ دھار لیتے ہیں۔

صحیح رویہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ بحران پیدا کر کے ان کو حل کرنے پر توجہ لگائی جائے' چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے بڑے مسائل تک پر گہری نظر ڈالی جائے اور ایک منظم طریقے سے ان کا نقشہ بنا کر' ان کو حل کیا جائے۔ مسائل درخت کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کی شاخیں کاٹنے کے بجائے ان کو جڑ سے اکھاڑنا ضروری ہے۔ اس طرح کا ایک قدم اٹھانے سے سیکڑوں مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

مسائل کی جڑ تین جگہ پائی جاتی ہے:

۱- **معاملہ فہمی :** حضور نبی کریمؐ نے معاملہ فہمی کی صلاحیت کی دعا کی ہے۔ مسئلے کی صحیح تشخیص نہ ہو تو حل کیسے ہوگا؟ اکثر مسائل کا تعلق حقیقت کے بجائے سمجھ بوجھ' نظریات' مفروضات اور تخیلات سے ہوتا ہے۔ ان کا راہ راست پر ہونا ضروری ہے۔

۲- **انسانی اسباب :** مسائل کی پشت پر کسی فرد کا' یا افراد کے کسی گروہ کا رویہ ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح ضروری ہے۔ اگر اصلاح ممکن نہ ہو تو تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

۳- **تنظیمی اسباب :** اختیارات کی تقسیم' ضابطوں کی ترتیب' حدود کار اور طریقہ کار میں مطلوبہ اہداف کے لحاظ سے ناہمواری بھی مسائل کو جنم دیتی ہے۔

اسلامی تحریکیں

چند اخوانی ادیب

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی ○

الاخوان المسلمون کے پانچ مرشدین عام منتخب ہوئے اور ان تمام رہنماؤں نے اپنے اپنے دور میں تحریک اسلامی اور ملک کی قیادت اپنے ذوق و رجحان اور صلاحیت و صالحیت کے مطابق کی۔ ان سب کا مطالعۂ اسلام بڑا وسیع و عمیق اور مشاہدۂ کائنات و تجزیۂ حالات بڑا بصیرت افروز' چشم کشا اور معنی خیز تھا۔ انھوں نے حق و باطل کی کش مکش میں کاروان اسلام کی علم برداری کی اور قید و بند اور طوق و سلاسل کی تمام آزمایشوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر کے دعوت و عزیمت اور جہاد و شہادت کی قندیلیں روشن رکھیں اور تاریخ اسلام میں فریضہ تجدید و احیاے دین کے باضابطہ تسلسل کی ضمانت فراہم کی۔ ان شہداے حق اور فاتحین سلاسل کی تحریروں اور تقریروں نے عالم اسلام میں احیا و اصلاح کی لہر دوڑا دی۔ ادیبوں اور شاعروں کے قلم میں ارتعاش پیدا کر دیا اور ان کی شاعری اور ان کا ادب لذت و تفریح اور بے مقصدیت سے کنارہ کش ہو کر زندگی کی اعلیٰ اقدار اور آفاقی اصولوں سے ہم آغوش ہو گیا۔

مرشد اول امام حسن البناؒ کی تحریروں میں سوز و گداز اور حدت و تپش تھی۔ ان کی شخصیت بڑی پُرکشش اور سحر آفریں تھی۔ ان کے الفاظ بڑے رسیلے اور میٹھے ہوتے تھے۔ مرشد ثانی حسن اسماعیل الہضیبیؒ فقہ و قانون کے ماہر تھے۔ ان کی تحریروں میں زور استدلال اور شان تفقہ نمایاں تھی۔ ان کی کتاب دعاۃ لاقضاۃ نے جبرو تشدد اور تکفیر کے ہم نواؤں کے ناطقے بند کر دیے اور ان کے سارے دلائل ہوا ہو گئے۔ تیسرے مرشد سید عمر تلمسانیؒ کو تجربات و مشاہدات کا حصہ وافر نصیب ہوا تھا اور عزیمت و استقامت کی تاریخ رقم کرنے کی سعادت ان کے حصے میں آئی تھی۔ ان کے جرأت مندانہ موقف نے عالم اسلام کو ان کا دیوانہ بنا دیا۔ چوتھے مرشد عام محمد حامد ابوالنصرؒ کم گو اور کم نویس تھے مگر عہد ناصری کے مظالم کی روداد لکھی تو پہلی بار تحریک کی کچھ اندرونی کمزوریاں اور منافقین کی ریشہ دوانیاں سامنے آئیں۔

○ ریڈر' ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز' علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی' بھارت

موجودہ مرشد عام مصطفیٰ مشہور مدظلہ العالی ایک کامیاب مصنف' محاضر اور خطیب ہیں اور اسلام اور تحریک اسلامی کے مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔

مرشدین عام کے علاوہ اخوان المسلمون کی صفوں میں درجہ اول کے ادیب اور مصنف پیدا ہوئے جنھوں نے انسانیت کے تمام مسائل پر اسلام کی مدلل' باوقار اور بے لاگ ترجمانی کی۔ یہ ادیب مصر کے علاوہ شام' لبنان' سعودی عرب' کویت' قطر' عراق' فلسطین' اردن اور عالم عرب اور عالم اسلام کے دوسرے ملکوں میں اپنی تحریروں سے امت اسلامیہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ایسے اسلام پسند ادیبوں اور مصنفین کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے مگر یہاں صرف چند شخصیات کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ خاص طور سے وہ اعلام اور علما یہاں زیر بحث ہیں جن کی تحریروں کے اردو میں تراجم ہوئے اور ان ترجموں نے ہندو پاک کی اسلامی فکر کے ارتقا پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

سید قطبؒ

عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت جسے الاخوان المسلمون کا نظریہ ساز (ideologue) قرار دیا گیا' پورا نام سید قطب ابراہیم حسین شاذلی تھا' ۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو بالائے مصر کے اسیوط شہر کے گاؤں موشا میں پیدا ہوئے۔ والد ابراہیم قطب' مصطفیٰ کامل کی پارٹی الحزب الوطنی کے رکن تھے۔ ۱۰ برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ ۱۹۱۸ء میں سرکاری اسکول سے ثانوی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم قاہرہ میں غیر رسمی طور سے کلاسز میں حاضری دی مگر ۱۹۳۰ء میں یہاں باضابطہ داخلہ لے لیا اور ۱۹۳۳ء میں بی اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی ذہانت و صلاحیت کی بدولت اسی کالج میں وزارت تعلیم کی جانب سے استاذ مقرر ہوئے۔ یہاں آپ کی ملازمت ۱۹۵۱ء تک رہی۔ آخر کے کچھ سال آپ نے انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت میں گزارے۔ اسی دوران ۱۹۴۸ء میں سید قطب کو مغربی نظام تعلیم کے مطالعہ کے لیے امریکہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں یونی ورسٹی آف ناردرن کولوریڈوز ٹیچرز کالج کے ولسنز ٹیچرز کالج میں آپ نے داخلہ لیا اور ایجوکیشن میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ کیلی فورنیا کی اسٹان فورڈ یونی ورسٹی سے بھی آپ نے استفادہ کیا۔ واشنگٹن کے علاوہ نیویارک' شکاگو' سان فرانسکو' لاس اینجلز اور دوسرے شہروں میں بھی جانے کا آپ کو موقع ملا۔ واپسی پر انگلستان' اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی چند ہفتے آپ نے گزارے۔ امریکہ کے قیام میں آپ نے مغربی تہذیب کی بربادی کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور اسلام پر ان کے ایمان و ایقان میں اضافہ ہوا۔

۱۹۳۰ء کے دور میں مصنف نے شاعری' ادب اور تنقید کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ ابتدا میں طٰہٰ حسین' عباس محمود العقاد اور احمد حسن الزیات سے بڑے متاثر تھے۔ مگر بعد میں ان کے اسلوب اور افکار کے مخالف اور ناقد بن گئے۔ اب امریکہ سے واپس ہوتے ہی ملک کے سماجی' معاشی

اور سیاسی و تہذیبی مسائل میں دل چسپی لی اور وزارت تعلیم میں مشیر کے عہدہ پر ترقی کے روشن امکان کو مسترد کر کے ملازمت ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۹۵۳ء میں الاخوان المسلمون میں شرکت اختیار کر لی اور اس کے ترجمان الاخوان المسلمون کے مدیر مقرر کیے گئے۔ بعد میں انھیں جماعت کے مرکزی دفتر میں شعبہ توسیع دعوت کا انچارج اور پھر مکتب الارشاد کا رکن منتخب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں مصر کے معاشرتی بہبود کے سرکل نے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے دمشق بھیجا جہاں آپ نے مختلف موضوعات پر لیکچر دیے۔ اس سال دسمبر میں آپ نے بیت المقدس میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو اخبار الاخوان المسلمون حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا کیونکہ اس نے اس اینگلو مصری پیکٹ کی مخالفت کی تھی جو ۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر اور انگریزوں کے مابین ہوا تھا۔ یہیں سے اخوان اور ناصر کے مابین کش مکش کا آغاز ہوا۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ایک محفل میں تقریر کرتے ہوئے صدر ناصر پر قاتلانہ حملہ ہوا اور حکومت نے اس کی ذمہ داری اخوان پر ڈال دی۔ دوسرے رہنماؤں کے ساتھ سید قطب بھی گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو عوامی عدالت نے آپ کو ۱۵ برس قید بامشقت کی سزا سنائی۔ ابھی قید کی زندگی کو ایک ہی سال گزرا تھا کہ حکومت کے ایک نمایندے نے جیل میں ان سے ملاقات کر کے درخواست کی کہ چند سطریں معافی کی لکھ دیں تو جیل سے آپ کو رہا کر دیا جائے گا مگر سید قطب نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ ۱۹۶۴ء کے وسط تک موصوف ملک کے مختلف جیل خانوں میں رہے۔ ابتدائی تین برسوں میں آپ کے ساتھ انتہائی جبر و تشدد اور اذیت و تعذیب کا سلوک روا رکھا گیا مگر بعد میں کچھ سانس لینے کی مہلت نصیب ہوئی تو تفسیر قرآن فی ظلال القرآن کی تکمیل میں لگ گئے۔ آخر کار عراق کے صدر عبدالسلام عارف مرحوم کی مداخلت پر آپ کو جیل سے رہائی ملی۔ اگست ۱۹۶۵ء میں سید قطب دوبارہ حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے اور ۲۵ اگست ۱۹۶۶ء کو عالم اسلام کے سخت احتجاج کے باوجود پھانسی پر لٹکا دیے گئے (سید قطب شہید کی تحریکی' ادبی اور علمی زندگی کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے' سید قطب شہید: حیات و خدمات' ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی و ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری' منشورات' منصورہ' لاہور)۔

سید قطب کی تصانیف کی تعداد ۲۲ ہے جو اس طرح ہیں: ۱- فی ظلال القرآن' ۲- العدالة الاجتماعية فی الاسلام' ۳- مشاهد القيامة فی الاسلام' ۴- التصوير الفنی فی القرآن' ۵- معركة الاسلام والراسمالية' ۶- السلام العالمی والاسلام' ۷- دراسات اسلامية' ۸- النقد الادبی: اصوله' ومناهجه' ۹- نقد كتاب مستقبل الثقافة فی مصر' ۱۰- كتب و شخصيات' ۱۱- نحو مجتمع اسلامی' ۱۲- امريكه التی رايت' ۱۳- اشواك' ۱۴- طفل من القرية' ۱۵- المدينة المسحورة' ۱۶- الاطياف الاربعة' ۱۷- القصص

الدینیۃ، ۱۸- فاقلۃ الرقیق، ۱۹- حلم الفجر، ۲۰- الشاطی المجھول، ۲۱- مھمۃ الشاعر فی الحیوۃ، ۲۲- معالم فی الطریق۔

عبدالقادر عودہؒ (م ۱۹۵۴ء)

شیخ عبدالقادر عودہ ایڈووکیٹ اخوان المسلمون کے نمایاں رہنماؤں میں سے تھے۔ موصوف شاہ فاروق کے دور میں مصری عدالت کے جج تھے مگر انھوں نے اس بنا پر اس عظیم منصب سے استعفا دے دیا تھا کہ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے غیرالٰہی قانون کے تحت مقدمات کے فیصلے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے بعد وہ اخوان سے منسلک ہو گئے اور نائب مرشد عام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ موصوف متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی وہ التشریع الجنائی الاسلامی (اسلام کا قانون فوجداری) ہے۔ اس کتاب نے دنیا کے قانون دان حلقوں سے بے پایاں خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب ۱۹۵۱ء میں تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کی اہمیت و ندرت کے پیش نظر حکومت کی طرف سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مصنف کو فواد الاول انعام دیا جائے مگر شرط یہ لگائی گئی کہ اس کتاب کے دو جملے حذف کر دیے جائیں۔ ایک جملہ یہ تھا کہ اسلام موروثی بادشاہت کا قائل نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ اسلام میں کوئی حاکم قانون سے بالا نہیں ہے۔ مصنف نے یہ جملے حذف کرنے سے انکار کر دیا اور اس انعام کو ٹھکرا دیا جو ایک ہزار مصری پونڈ کی مقدار میں انھیں مل رہا تھا۔ انھیں شاہ فاروق کی ناراضگی بھی مول لینا پڑی کیونکہ ان جملوں کی زد براہ راست فاروق پر پڑتی تھی۔ عودہؒ کی دیگر تصانیف اس طرح ہیں:

○ الاسلام و اوضاعنا القانونیۃ (اسلام اور ہمارا قانونی نظام) ○ الاسلام و اوضاعنا السیاسیۃ (اسلام اور ہمارا سیاسی نظام) ○ المال والحکم فی الاسلام (اسلام میں مالیات اور حکمرانی کے اصول) ○ الاسلام حائر بین جھل ابنائہ وعجز علمائہ (اسلام اپنے فرزندوں کی جہالت اور اپنے علما کی کوتاہ دستی پر حیران ہے!) (خلیل احمد حامدی، اخوان السملمون، تاریخ، دعوت، خدمات، ص ۸۰-۸۱)۔

دسمبر ۱۹۵۴ء میں جن چھ اخوانی رہنماؤں کو پھانسی کی سزا دی گئی ان میں عبدالقادر عودہ شہید بھی تھے۔ پیرس کے اخبار فرانس سوار نے ان رہنماؤں کی شہادت کے چشم دید ایمان افروز واقعات لکھے ہیں۔ نامہ نگار کہتا ہے کہ:

> چھٹا اور آخری ملزم جسے دار کی طرف بڑھنا تھا، شیخ عبدالقادر عودہ تھے۔ موصوف اخوان کی تحریک کے فکری رہنما ہیں۔ نجیب اور اخوان کے درمیان آپ ہی حلقہ اتصال تھے۔ انھوں نے عدالت کے اندر عدالت کے فیصلوں پر بڑی عالمانہ بحث کی اور جب انھیں موت کا فیصلہ سنایا گیا تو جواب میں مسکرا دیے اور شکریے کے ساتھ اسے قبول کیا۔ یہ ہمارے سامنے اس انداز سے گزرے کہ

ان کی گردن بلند تھی اور تحمل قدم قدم سے عیاں تھا۔ آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ گرج دار آواز سے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور آخر میں انھوں نے چند اشعار پڑھے جن کا مطلب یہ تھا کہ "اگر میں اللہ کی راہ میں جان دے رہا ہوں تو پھر مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے"۔ انھوں نے اپنا سر اچھی طرح اوپر اٹھا کر کہا "میرا خون نظام حاضر کے لیے لعنت ثابت ہو گا"۔ انھوں نے کوئی چیز لینے سے انکار کر دیا۔ تختہ دار کی جانب جاتے ہوئے وہ اپنے دونوں جلادوں سے آگے نکل گئے (ایضاً، ص ۸۷)۔

مصطفی محمد الطحان

اخوان المسلمون کے بانی اور رہنماؤں کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور زندگی اسلامی تحریک کی خدمت میں وقف کر دی۔ ۱۹۳۸ء میں لبنان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں استنبول یونی ورسٹی ترکی سے کیمیکل انجینئرنگ میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۹ء تک کویت میں پیٹرولیم کے میدان میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء کے درمیان ترکی میں اسلامی طلبہ تحریکات کے قیام و استحکام کے لیے متحرک رہے۔ ۱۹۶۹ء میں عالم عرب میں موجود استنبول یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ کی تنظیم قائم کی اور انھیں احیاے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے پر ابھارا۔ **الاتحاد الاسلامی العالمی للمنظمات الطلابیہ** کویت کی تاسیس میں پیش پیش رہے اور اس کے قیام کے پہلے سال ہی ۱۹۶۹ء میں خازن مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۷ء کے دوران آپ برابر اس کی جنرل سکریٹریٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ جولائی ۱۹۸۰ء میں اس عالمی تنظیم کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس تنظیم کے شعبہ اشاعت کتب کے تحت دنیا کی ۱۰۰ سے زیادہ زبانوں میں اسلامی ادبیات کے تراجم اور ان کی نشرو طباعت کے عظیم منصوبے کے براہ راست نگراں بھی رہے۔ عالم اسلام کی اسلامی تحریکات کی خبروں کی اشاعت کے لیے بیک وقت انگریزی اور عربی میں مجلہ **الاخبار** بلیٹن کی ادارت کر رہے ہیں۔ اس وقت **الموتمر العالمی للتجمعات الاسلامیة** کے جنرل سیکرٹری ہیں جس کا صدر دفتر استنبول میں ہے۔

فکر اسلامی اور دعوتی و جہادی تحریکات پر آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

○ **الفکر الحرکی بین الاصالة والانحراف** (تحریکی فکر، بنیاد پرستی اور انحراف کے درمیان) ○ **الحرکة الاسلامیة الحدیثة فی ترکیا** (ترکی میں جدید اسلامی تحریک) ○ **القومیة بین النظریة والتطبیق** (قومیت، نظریہ اور نفاذ) ○ **نظرات فی واقع الدعوة والدعاة** (دعوت اور داعی کے مسائل پر غور و فکر کے چند پہلو) ○ **نظرات فی واقع المسلمین السیاسی** (مسلمانوں کی سیاسی صورت حال پر چند

مباحث) ○ القیادة فی العمل الاسلامی (اسلامی کاز کی قیادت) ○ فی التدریب التربوی (تربیتی ٹریننگ کے مسائل) ○ حاضر العالم الاسلامی ۱۹۹۱ م (۱۹۹۱ء میں عالم اسلام کی صورت حال) ○ حاضر العالم الاسلامی ۱۹۹۲ م (۱۹۹۲ء میں عالم اسلام کی صورت حال) ○ فلسطین والموامرة الکبری (فلسطین اور عالمی سازشیں) ○ مستقبل الاسلام فی القوقاز و بلاد ماوراء النهر (قفقاز اور بلاد ماوراء النہر میں اسلام کا مستقبل) ○ دور الشباب فی اعادة بناء الامة (امت کی تعمیر نو میں نوجوانوں کا کردار) ○ النظام الاسلامی منهاج متفرد (اسلام' ایک منفرد نظام) ○ رد علی کتاب آیات شیطانیة (شیطانی آیات کی تردید) ○ شخصیة المسلم المعاصر (معاصر مسلمان کا تشخص) ○ تحدیات سیاسیة تواجه الحرکة الاسلامیة (اسلامی تحریک' سیاسی بحرانوں کے مقابلہ میں) ○ المراة فی موکب الدعوة (دعوت دین اور خواتین)۔ (مصطفیٰ محمد الطحان' وسط ایشیا میں اسلام کا مستقبل' اردو ترجمہ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی' ہلال پبلی کیشنز' علی گڑھ' ۱۹۹۶ء' ٹائٹل کا آخری صفحہ)۔

ڈاکٹر طه جابر العلوانی

آپ ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں عراق میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر گئے اور ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء میں جامعہ الازہر قاہرہ سے کلیة الشریعة سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہیں سے ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء میں ایم اے کیا اور ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۳ء میں اصول الفقہ میں پی ایچ ڈی بھی یہیں سے کیا۔

ڈاکٹر طہ جابر العلوانی ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء سے ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء تک دس سال جامعہ الامام محمد بن سعود ریاض میں فقہ اور اصول فقہ کے پروفیسر رہے۔ علوم و فنون کی اسلام کاری اور لسانی و عمرانیاتی علوم و مسائل کے اسلامی مطالعہ سے فاضل مصنف کو خصوصی دلچسپی رہی۔ یہ تحریک انھیں اخوان کے بانی اور رہنماؤں کی تحریروں اور ان کے صبر و عزیمت کی داستانوں سے ملی۔ چنانچہ ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایسے ہی ایک علمی و تحقیقی ادارہ کی بنیاد پڑی تو موصوف اس کے موسسین میں شامل تھے۔ اس ادارہ کا نام رکھا گیا المعهد العالمی للفکر الاسلامی (International Institute of Islamic Thought) موصوف آج کل اس کے صدر اور بورڈ آف ٹرسٹیز کے رکن رکین ہیں۔ اس ادارہ نے ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی شہید کی قیادت میں علمی محاذ پر بڑا قیمتی اور عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور وہ ہے عمرانیاتی علوم کی اسلام کاری کی تحریک کی داغ بیل۔ ڈاکٹر العلوانی رابطہ العالم الاسلامی مکہ کے موسس رکن ہیں۔ ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء سے منظمة الموتمر الاسلامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے ممبر ہیں اور ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء سے فقہ کونسل آف نارتھ امریکہ کے صدر ہیں۔

اسلامی فقہ آپ کی دلچسپی کا خصوصی موضوع ہے۔ مندرجہ ذیل تصانیف بڑی اہم ہیں:

امام فخرالدین رازی کی کتاب **المحصول فی علم الفقه** کی ترتیب و تحقیق (چھ جلدوں میں)۔

○ **الاجتهاد والتقليد فی الاسلام** (اسلام میں اجتہاد اور تقلید) ○ **حقوق المتهم فی الاسلام** (اسلام میں ملزم اور متہم کے حقوق) ○ **ادب الاختلاف فی الاسلام** (اسلام میں اختلاف کے اصول) ○ **اصول الفقه الاسلامی منهج بحث و معرفة** (اسلامی فقہ کے اصول اور منہاجیات)۔

فکر اسلامی کے دوسرے موضوعات پر بھی آپ نے گراں قدر کام کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

○ **اصلاح الفكر الاسلامی بين القدرات والعقبات، ورقة عمل** (فکر اسلامی کی اصلاح، صلاحیتیں اور رکاوٹیں) ○ **الازمة الفكرية المعاصرة** (معاصر فکری بحران) ○ **خواطر فی الازمة الفكرية والمازق الحضاری فی الامة الاسلامية** (امت مسلمہ کو درپیش فکری و تہذیبی بحران پر کچھ بحثیں)۔

(Taha Jabir al-Alwani, ijtihad, International Institute of Islamic Thought, Herndon, USA, 1993, p. 32.)

ڈاکٹر عماد الدین خلیل

موصوف عراق کے شہر الموصل میں ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد بغداد یونی ورسٹی ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء میں بی اے اور ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء میں اسلامی تاریخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد جامعہ عین شمس قاہرہ میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء میں تاریخ اسلامی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ ۸۷-۱۳۸۶ھ / ۶۷-۱۹۶۶ء میں سنٹرل لائبریری الموصل یونی ورسٹی عراق کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اسی یونی ورسٹی کے آرٹس کالج میں ۱۳۸۷ھ سے ۱۳۹۷ھ تک (۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۷ء تک) اسسٹنٹ لیکچرار، لیکچرار اور ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے اور اسلامی تاریخ، منہاجیات تحقیق اور فلسفہ تاریخ کے مضامین کی تدریس کی۔ ۱۳۹۷ھ سے ۱۴۰۷ھ (۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء) تک آپ نے شعبہ اثریات کے صدر، کلچرل میوزیم لائبریری کے ڈائرکٹر اور عراقی منطقہ شمالی کے آثار قدیمہ اور عجائب گھروں کے جنرل ڈائرکٹوریٹ میں سینیئر ریسرچ فیلو کی حیثیت میں شاندار خدمات انجام دیں۔ آج کل صلاح الدین یونی ورسٹی اربیل عراق کے آرٹس کالج میں اسلامی تاریخ، منہاجیات و فلسفہ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر عمادالدین خلیل نے مختلف عرب یونی ورسٹیوں اور علمی، تحقیقی اور تربیتی اداروں میں لیکچرز اور توسیعی خطبات دیے اور خلیجی ممالک کی تنظیم Islamic, Educational, Scientific and Cultural Organization (ISESCO) میں مختلف علمی اور تحقیقی منصوبوں کی تکمیل میں تعاون کیا۔ مختلف عالمی علمی اجتماعات اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ ان میں ۱۹۷۱ء کی بغداد میں یونی ورسٹی ایجوکیشن پر

پہلی انٹرنیشنل کانفرنس اور ۱۹۷۹ء میں قطر میں منعقد سیرت اور سنت نبوی پر تیسری عالمی کانفرنس اہم ہیں۔ اسلامی تاریخ، منہاجیات اور فلسفہ تاریخ نیز ادب و تنقید پر آپ کی تخلیقات بہت قابل دید ہیں۔ آپ ۵۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور سیکڑوں مقالات و مضامین شائع کرا چکے ہیں۔

(Taha Jabir al-Alwani and Imad al-Din Khalil, The Quran and the Sunnah: The Time-Space Factor, International Institute of Islamic Thought, Herndon, USA, 1991, pp 57-58).

آپ کی چند کتابیں یہ ہیں: ○ مع القرآن فی عالمه الرحیب (قرآن کی وسیع کائنات میں) ○ آفاق قرآنیه (قرآنی آفاق) ○ مقال فی العدل الاجتماعی (اسلام کے عدل اجتماعی پر ایک گفتگو) ○ اسلام فی مواجهة المادیة (سائنس مادیت کے مقابلہ میں) ○ مدخل الی موقف القرآن من العلم الحدیث (جدید سائنس کے تئیں قرآن کا موقف) ○ حول اعادة تشکیل العقل المسلم (فکر اسلامی کی تشکیل جدید) ○ فی الرؤیة الاسلامیة (اسلامی تناظر) ○ فی النقد الاسلامی المعاصر (معاصر اسلامی تنقید نگاری) ○ مدخل الی نظریة الادب الاسلامی (ادب اسلامی کا نظریہ) ○ حول اعادة کتابة التاریخ الاسلامی (اسلامی تاریخ نگاری کی تشکیل نو) ○ التفسیر الاسلامی للتاریخ (تاریخ کی اسلامی تفسیر) ○ فی التاریخ الاسلامی: فصول فی المنهج والتحلیل (اسلامی تاریخ: منہاجیات اور تجزیہ پر چند مباحث) ○ ابن خلدون اسلامیا (علامہ ابن خلدون، اسلام کے علم بردار مفکر) ○ دراسة فی السیرة (سیرت طیبہ پر ایک مطالعہ) ○ الامارات الارتقیة فی الجزیرة والشام: اضواء جدیدة علی المقاومة الاسلامیة للصلیبیین والتتر (جزیرہ عرب اور شام میں ارتقی حکومتیں: صلیبیوں اور تاتاریوں کے خلاف اسلامی مزاحمت پر نئی روشنی) ○ ملامح الانقلاب الاسلامی فی خلافة عمر بن عبدالعزیز (حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں اسلامی انقلاب کے نقوش) ○ مدخل الی اسلامیة المعرفة مع مخطط مقترح لاسلامیة علم التاریخ (علم کی اسلام کاری، تاریخ کی اسلامی تشکیل نو پر ورک پلان)۔ (عماد الدین خلیل، مدخل الی اسلامیة المعرفة مع مخطط مقترح لاسلامیة علم التاریخ، المعهد العالمی للفکر الاسلامی، ہیرنڈن، امریکہ، ۱۹۹۱ء، ٹائٹل، ص ۲)۔

ڈاکٹر عبدالحمید احمد ابو سلیمان

سعودی عرب کے شہر مکۃ المکرمہ میں شوال ۱۳۵۵ھ / دسمبر ۱۹۳۶ء میں آپ پیدا ہوئے۔ ہائر سیکنڈری کی سند ۱۹۵۵ء میں مکہ سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے قاہرہ تشریف لائے اور وہاں کے کالج آف کامرس سے پولٹیکل سائنس میں ۱۹۵۹ء میں بی اے اور پھر ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۷۳ء

میں پنسلوانیا یونی ورسٹی فلاڈلفیا سے اسلام اور بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا:

The Islamic Theory of International Relations: New Directions for Islamic Methodology and Thought.

بعد میں المعهد العالمی للفکر الاسلامی نے ۱۹۸۷ء میں اسے تزک و احتشام سے شائع کیا۔

ڈاکٹر ابو سلیمان نے سپریم پلاننگ بورڈ میں ۶۴-۱۹۶۳ء میں اس کے قائم مقام معتمد کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ریاض یونی ورسٹی کے اسکول آف کامرس میں اور بعد میں اسکول آف پبلک ایڈمنسٹریشن میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک پولٹیکل سائنس شعبہ کے صدر رہے۔ اس کے بعد دو سال کی رخصت لے کر المعهد العالمی للفکر الاسلامی امریکہ کے ڈائرکٹر جنرل کے منصب پر فائز ہوئے۔

موصوف نے ۱۹۷۲ء میں ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس (Association of Muslim Social Scientists) کی بنیاد رکھی تھی۔ وہیں سے علمی و فکری سطح پر اسلام کاری کے لیے ایک بین الاقوامی ادارہ کے قیام کا خاکہ ذہن میں آیا تھا جو دوسرے اصحاب فکر، احباب اور رفقا کے تعاون سے ۱۹۸۱ء میں المعهد العالمی للفکر الاسلامی کی تاسیس کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ موصوف نے اس عالمی ادارہ کی سربراہی اس کی تاسیس سے لے کر ۱۹۸۴ء تک فرمائی۔ اس وقت آپ انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی ملایشیا کے ریکٹر کے عہدہ پر مامور ہیں۔

فاضل محقق عالم اسلام کے مسائل و معاملات پر بصیرت و ادراک کے ساتھ مختلف علمی، تحقیقی، تعلیمی اور تربیتی و تہذیبی اداروں اور تنظیمات کی رہنمائی میں شریک اور امت مسلمہ کی فکری و دانش ورانہ قیادت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے اسلامی میراث کی منہاجیات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ آپ کی کچھ اہم تحریریں یہ ہیں: ○ قضية المنهجية فی الفکر الاسلامی (فکر اسلامی میں منہاجیات کا مسئلہ) ○ ازمة العقل المسلم (فکر اسلامی کا بحران)۔

Abdul Hamid A. Abu Sulayman, The Islamic Theory of International Relations, IIIT, Herndon, 1987, Title Cover p.2.

ڈاکٹر فتحی یکن

لبنان میں اسلامی تحریک کی تخم ریزی کرنے والوں میں فتحی یکن کا نام بہت نمایاں ہے۔ آپ نے امام حسن البنا اور اخوانی رہنماؤں سے کسب فیض کیا۔ ان کی تحریک سے متاثر ہوئے اور لبنان میں اسلامی احیا و

تجدید کے فرائض میں لگ گئے۔ آپ کی پیدائش طرابلس میں ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ وہ دراصل "یکن" خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اصلاً تعلق ترکی کے شہر سیواس سے تھا۔ یہ خاندان علم و تہذیب میں مشہور تھا۔

ابتدائی تعلیم المعھد الامریکی سے حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں الیکٹرانک انجینئرنگ سے فراغت پائی۔ وہ اپنے مضمون کے ماہر اور تجربہ کار انجینئر تھے۔ انھوں نے ایک ریڈیو اسٹیشن کا خاکہ بنایا جس نے چھٹی دہائی کے اوائل میں صوت لبنان الحر کے نام سے کام کرنا شروع کیا۔ اس ریڈیو اسٹیشن نے آگے چل کر ۱۹۷۴ء میں اذاعۃ صوت المجاھدین کا نام اختیار کر لیا۔ ۱۹۷۳ء میں آپ نے کراچی یونی ورسٹی پاکستان سے اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آغاز عمر ہی سے تحریک اسلامی کے مسائل میں دل چسپی لی۔ الجماعۃ الاسلامیۃ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے اور ۱۹۹۲ء میں لبنانی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہونے تک اس منصب پر فائز رہے۔ اس وقت بھی وہ پارلیمنٹ کے رکن اور الجماعۃ الاسلامیۃ کے صدر ہیں۔

لبنان عالم عرب میں کثیرالمذاہب والقومیات، مخصوص رجحان اور طرز فکر کا حامل ملک ہے۔ ملک کی آبادی تین ملین سے زیادہ نہ ہوگی جبکہ اس کی مساحت (رقبہ) ۱۰ ہزار ۴ سو مربع کلومیٹر ہے اور ۱۷ مذاہب سے زائد وہاں وجود رکھتے ہیں۔ ایسے ملک میں دعوت اسلامی کا اپنا ایک مخصوص اسلوب اور منہاج ہوگا جو عالمی تحریکات اسلامی سے جدا اور ممتاز ہوگا۔ ۱۹۹۲ء کے پارلیمانی انتخابات میں الجماعۃ الاسلامیۃ نے شرکت کی اور دو نشستوں پر کامیابی حاصل کر کے لبنان کی سیاست میں ایک نئے تجربے کا آغاز کیا۔ لبنانی پارلیمنٹ میں تین سال گزارنے کے بعد ڈاکٹر فتحی یکن نے اس تاثر کا اظہار کیا کہ سوویت یونین کے زوال کے بعد بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتیں اس وقت شکست و ریخت سے دوچار ہیں اور عوام کو بھی اب احساس ہو گیا ہے کہ یہ ملک و قوم کو خندق میں دھکیل رہی ہیں۔ دوسری بات انھوں نے یہ بتائی کہ ناصرازم، قومیت، اشتراکیت اور بعثیت وغیرہ ملحدانہ نظریات اور تحریکوں نے اقتدار میں آنے کے بعد ہر ملک کی تحریک اسلامی کو قیدوبند، داروگیر اور ایذا و تعذیب کا نشانہ بنایا ہے جس کے دو نقصانات ہوئے ہیں: ۱- تحریک اسلامی کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنی پڑی، ۲- تحریک اسلامی عوامی تحریک نہ بن سکی۔ لیکن اب صورت حال تبدیل ہو رہی ہے۔ لبنانی پارلیمنٹ میں پہنچنے کے بعد آغاز میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ اندر سیاسی لابی کی تشکیل تو کجا، طریقہ کار اور منہاج و اسلوب کو سمجھنے میں کافی وقت لگا مگر رفتہ رفتہ الجماعۃ الاسلامیۃ عقائد و افکار اور عام بنیادی اخلاقیات سے متعلق قانون سازی میں موثر ثابت ہونے لگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ تحریک اپنی اشرافی سطح سے نیچے اتر کر عوامی تحریک بنی۔ انداز گفتگو، اسلوب تحریر و تقریر، مسائل کے تجزیہ و پیش کش ہر سطح پر عوام کی دلچسپی اور معیار کو سامنے رکھا جانے لگا اور

تحریک اسلامی عوام کے دلوں کی دھڑکن بننے لگی۔ اب جو لٹریچر دعوت و تبلیغ کے لیے شائع ہو رہا ہے اس میں عوامی ذوق و معیار کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو اس میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

عالمی اسلامی تحریکات کو داخلی سطح پر درپیش بحرانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فتحی یکن نے کہا کہ اس سیاق میں دو پہلو بہت اہم ہیں:

۱۔ معاشرتی' معاشی' سیاسی' دعوتی' تنظیمی اور منصوبہ بندی کی تمام سطحوں پر قیادت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے مطلوبہ صفات اور صلاحیتوں کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح کی صلاحیتوں کی نشوونما اور نئے کیڈر کی فراہمی وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

۲۔ اسلامی کاز کی سطح پر باہم متصادم تکثیریت بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔ ہر اسلامی گروہ دوسرے پر خط تنسیخ پھیرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں مطلوب یہ ہے (ان کان لابد من التعددیة فیحب ان تکون تعددیة توافقیة وتعاونیة وتکاملیة ولیست تعددیة تصادمیة) یعنی اگر مختلف گروہوں کا وجود ناگزیر ہو تو ان کے درمیان لازمی طور پر توافق' تعاون اور تکافل ہو۔ وہ باہم معرکہ آرا نہ ہوں (ہفت روزہ المجتمع' کویت' شمارہ ۱۱۵۲' ۸ محرم ۱۴۱۶ھ / ۶ جون ۱۹۹۵ء' ص ۲۲)۔

ان کی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

○ المتغیرات العالمیة والدور المنشود (عالمی تبدیلیاں اور اسلام کا مطلوبہ کردار) ○ مشکلات الدعوة والداعیة (دعوت اور داعیان کرام کے مسائل) ○ کیف ندعوا الی الاسلام (ہم دعوت کا کام کیسے کریں؟) ○ نحو حرکة اسلامیة عالمیة واحدة (ایک عالمی اسلامی تحریک کے قیام کی ضرورت)۔

ڈاکٹر سعید رمضان (۱۹۲۶ء - ۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر سعید رمضان جنیوا سوئٹزرلینڈ میں ۶۹ سال کی عمر میں ۵ اگست ۱۹۹۵ء کو انتقال کر گئے۔ جسد خاکی قاہرہ لایا گیا۔ مسجد رابعہ عدویہ نصر سے جنازہ کی میت میں لاکھوں آدمیوں نے شرکت کی۔ ۹ اگست کو استاذ اور معلم امام حسن البنا شہید کے جوار میں البساتین قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ مصر اور عالم اسلام کی تنظیم الاخوان المسلمون اور اسلامی تحریکات نے ایک عزیز دوست' ایک عظیم مجاہد' شعلہ بیان خطیب' ممتاز مفکر و مصنف اور اخوان المسلمون جماعت کی صف اول کے رہنما اور داعی کی رحلت پر گہرے دکھ اور قلبی غم و تاسف کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر سعید رمضان البوطی مصر کے شہر طنطا میں ۱۲ اپریل ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے اور اس شہر کی اخوان شاخ کے رہنما اور عالم ڈاکٹر البہی الخولی کے ہاتھوں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں لا کالج قاہرہ

یونی ورسٹی سے فارغ ہوئے۔ طالب علمی کے دور میں اپنی ایمان افروز، رقت انگیز اور مجاہدانہ شان کی حامل تقریروں کی بدولت بڑے مقبول ہوئے اور یونی ورسٹی میں اخوان کی دعوت اور تحریک سے طلبہ کو بڑے پیمانے پر متعارف کرایا اور ان میں فی سبیل اللہ جہاد و شہادت کا جذبہ پیدا کیا۔

چوتھی دہائی میں اخوان نے ماہنامہ مجلہ الشہاب جاری کیا تو ڈاکٹر رمضان ۴۸-۱۹۴۷ء میں اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ امام حسن البنا آپ سے قریبی لگاؤ اور قلبی تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں امام کی شہادت عمل میں آئی تو ڈاکٹر رمضان نے تعلق خاطر کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے آپ کی بڑی صاحبزادی سے نکاح کر لیا جن سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئیں۔ پہلے صاحبزادے کا نام ایمن ہے جو سوئٹزرلینڈ کے ایک ماہر ڈاکٹر ہیں۔ دوسرے صاحبزادے کا نام ڈاکٹر ہانی ہے جنھوں نے جامعہ ازہر سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یورپ میں دعوت اسلامی کے کام میں مصروف ہیں۔ تیسرے صاحبزادے کا نام طارق ہے جنھوں نے ڈاکٹریٹ مکمل کر لیا ہے۔ یہ سوئٹزرلینڈ کے ایک معروف ہفت روزہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد بلال اور یاسر اور صاحبزادی اروی ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہاں کی زیارت کرنے والے اولین اخوانی وفد کی ۱۹۴۸ء میں آپ نے قیادت کی اور عالم اسلام میں ہمیشہ اس کی حمایت اور تائید میں سرگرم رہے۔ بعد میں متعدد بار ہندستان، پاکستان اور جنوب مشرقی ایشیا کا سفر کیا اور یہاں کے دینی، دعوتی اور تربیتی پروگراموں میں لیکچر دیا۔

آپ نے مجلہ الشہاب کے بعد ۱۹۵۱ء میں قاہرہ سے ماہنامہ المسلمون نکالا۔ یہ رسالہ پانچویں دہائی میں عالم اسلام کے ممتاز حامیوں، مصنفوں اور ادبا کا ترجمان بن گیا تھا اور اس کا معیار کافی بلند تھا۔ اخوان کے انقلابی کونسل سے اختلافات ہوئے تو حکومت نے رسالہ بند کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں کچھ دنوں کے لیے آپ جیل میں بند کر دیے گئے۔ اسی سال اخوان کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور دارو گیر کا ہنگامہ برپا ہوا تو ڈاکٹر رمضان دعوت اخوان کی امانت سینے سے لگائے ملک سے باہر نکل گئے۔ آپ کی عدم موجودگی میں عوامی عدالت میں آپ کے خلاف مقدمہ چلا اور آپ کے خلاف قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ مصری حکومت نے سب سے پہلے آپ کی شہریت غصب کی۔ ملک سے باہر رہ کر آپ نے حکومت کے مظالم پر مسلسل لکھا اور ناصری دور کے استبداد اور بدترین آمریت سے برابر پردہ اٹھاتے رہے۔ نتیجے کے طور پر حکومت نے متعدد بار آپ کو قتل کرانے کی سازش کی لیکن وہ ناکام رہی اور اللہ نے غیب سے آپ کی مدد کی۔

مصر سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر سعید رمضان البوطی نے قدس، شام، لبنان اور اردن میں کچھ وقت گزارا۔ اردن کے دوران قیام میں آپ ۱۹۵۳ء میں مؤتمر العالم الاسلامی کے جنرل سیکرٹری رہے۔ آپ نے سعودی عرب میں بھی قیام کیا اور اس دوران رابطہ العالم الاسلامی کی تاسیس ہوئی، تو اس میں پیش پیش رہے۔ پھر

یورپ منتقل ہو گئے اور ۱۹۵۸ء میں جنیوا میں مستقل رہایش اختیار کر لی۔ وہاں دعوت اسلامی کے مقاصد کو فروغ دینے کے لیے ۱۹۶۱ء میں اسلامی سنٹر قائم کیا۔ یورپ میں مغربی مسلمانوں میں وحدت و اخوت قائم کرنے اور فکر اسلامی کو موثر اور بار آور بنانے میں اس مرکز نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر سعید رمضان البوطی نے ۱۹۵۹ء میں کولون یونی ورسٹی جرمنی سے قانون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مصری حکومت نے ۱۹۵۵ء میں شہریت سے محروم کیا تو اردن، سعودی عرب اور پاکستان کی حکومتوں نے آپ کو ویزے دیے۔ آپ نے عالم عرب، عالم اسلام اور یورپ کے بیشتر ملکوں کے دورے کیے اور وہاں اخوان کی فکر، طریق کار اور اصولوں کو عام کیا۔ وہ یورپ میں اخوان کے سب سے بڑے وکیل اور ترجمان سمجھے جاتے تھے (ہفت روزہ المجتمع، کویت، شمارہ ۱۱۶۲، ۱۸ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ / ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء، ص ۴۱)۔

آپ کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں: ○ فقه السيرة النبوية مع موجز التاريخ الخلافة الراشدة (سیرت نبوی مع مختصر تاریخ، خلافت راشدہ) ○ Three Major Problems Confronting the World of Islam (عالم اسلام کو درپیش تین اہم مسائل) ○ Islamic Law: It's Scope and Equity

(جاری)

دیرپا ترقی' فطرت کے ساتھ ساتھ

شہزادہ چارلس

ترجمہ: عطاالرحمٰن

گذشتہ ۴۰ برس سے بی بی سی اپنے ڈائرکٹر ریتھ (Reith) کی یاد میں اہم موضوعات پر ریتھ لیکچر کا اہتمام کر رہی ہے۔ اس سال دیرپا ترقی (sustained development) کے موضوع پر چھ خطبے دیے گئے۔ پانچ نامور سائنس دانوں کے بعد آخری خطبہ پرنس چارلس نے دیا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم اس کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

دنیا بھر میں لاکھوں سننے والوں کی مانند میں بھی "دیرپا ترقی" کے بارے میں پانچ انتہائی ممتاز مقررین کی امیدوں' خدشات اور خیالات سے مستفید اور متاثر ہوا ہوں۔ یہ سب خیالات ان مقررین نے اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں پیش کیے ہیں۔ پانچوں تقاریر انتہائی خیال انگیز اور سوچ و فکر کی دنیا کے لیے چیلنج کا درجہ رکھتی ہیں۔ کسی نے زیر بحث موضوع کے ایک پہلو پر زیادہ زور دیا اور کسی نے دوسرے پر' تاہم ان کے مابین کئی ایک امور پر اتفاق رائے بھی موجود ہے۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دیرپا ترقی' بلند مقاصد کی خاطر ذاتی مفاد کا معاملہ ہے۔ دو مقررین نے تو اظہار خیال کے دوران اس اصطلاح کو استعمال کیا' جب کہ میں نہیں سمجھتا کہ بقیہ تین کو اس سے کوئی اختلاف تھا۔ خود میں بھی اس خیال کے ساتھ متفق ہوں۔

ذاتی مفاد ہم سب کے اندر ایک طاقت ور جذبے اور محرک کے طور پر کارفرما رہتا ہے۔ اگر ہم کسی طرح اپنے کو اس بات پر قائل کرلیں کہ دیرپا ترقی ہمارے اپنے مفاد میں ہے تو ہم اس کے حصول کی جانب پہلا اہم قدم اٹھالیں گے۔

لیکن ذاتی مفاد کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یہ باہم متقابل صورتوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سب صحیح منزل کی جانب لے جانے والی بھی ہوں' نہ ان سب میں یہ امکان ہی پایا جاتا ہے کہ

آنے والی نسلوں کی کئی جہتوں پر مشتمل ضروریات اور تقاضوں سے پوری طرح عہدہ برا ہو سکیں۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ دیرپا ترقی کی طویل شاہراہ پر گامزن رہنے کے لیے ہمیں جن مشکلات کا سامنا ہے' ان سے صحیح معنوں میں نمٹنے کے جذبے کو اپنے اندر بیدار کرنے کے لیے کسی تاخیر کے بغیر زیادہ گہرائی میں اتر کر ایک اخلاقی نصب العین کو اختیار کرنا ہوگا۔ اگرچہ اس دور میں انسانی زندگی کی روحانی جہتوں کے بارے میں بات کرنا فیشن کے بہت زیادہ خلاف ہو گیا ہے' لیکن میں آج یہی کرنا چاہتا ہوں۔

یہ تصور کہ بنی نوع انسان اور خالق کائنات کے مابین روز اول سے ایک مقدس عہد چلا آ رہا ہے' جس کے تحت ہم انسانوں کو روے ارض پر قیادت کے مقام پر فائز کیا گیا ہے' تاریخ کے ہر دور میں بیش تر مذاہب اور روحانی افکار کا اہم باب رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی' جن کے عقائد میں خالق کا کوئی وجود نہیں ملتا' اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر یہی موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ تو تھوڑے عرصے کی بات ہے کہ سائنسی عقلیات کے دھارے نے اس رہنما اصول کو اٹھا کر دور پھینک دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمیں دیرپا ترقی واقعی حاصل کرنا ہے تو پہلے عالم فطرت کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ معاملات میں روحانیت کے احساس کی بازیافت کرنا ہوگی اور اس کی اہمیت کو دوبارہ تسلیم کرنا ہو گا۔ اگر ہم ان باتوں کو ضعیف الاعتقادی پر مبنی یا خلاف عقل قرار دینے کی روش پر قائم رہیں گے اور اپنے لیے مقدس نہیں جانیں گے تو پھر اس کائنات کی ہمارے لیے اس سے زیادہ کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ حیات انسانی کے لیے امکانی طور پر دیرپا اور تباہ کن نتائج سے بھرپور ایک بہت بڑی تجربہ گاہ ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ روحانیت کے صحیح ادراک سے ہمیں یہ تسلیم کرنے میں مدد ملے گی کہ عالم فطرت کے اندر پایا جانے والا حسن توازن' نظم اور ہم آہنگی سب مل کر ہمارے عزائم کو ان حدود سے آشنا کرتے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے دیرپا ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہا جا سکتا ہے۔ چند معاملات ایسے ہیں جن میں سائنسی عقلیات کی سطح پر بھی حدود فطرت سے آگاہ ہوا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ دامن کوہ پر یک دم بہت زیادہ بھیڑوں کو گھاس چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دینا' آخر کار بھیڑوں اور دامن کوہ میں سے کسی ایک یا دونوں کے لیے معکوس نتائج کا باعث ہو سکتا ہے۔ یا جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جراثیم کش اور انٹی بائیوٹک ادویات کی کثرت استعمال سے قوت مدافعت کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب تو ہمیں کرہ ارض کی فضاؤں میں ضرورت سے زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرنے کے مکمل اور ہولناک نتائج کا شعور بھی حاصل ہونا شروع ہو گیا ہے۔ تاہم وہ اقدامات جو حدود فطرت کی پامالی سے جنم لینے والے نقصانات کے تدارک کے لیے کیے جا رہے ہیں' دیرپا نتائج کے حصول میں ناکافی ثابت ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی تک بہت سے حلقے یہ رائے رکھتے ہیں کہ چونکہ پودوں اور جانوروں میں مصنوعی

طریقوں کے ساتھ حیاتیاتی تبدیلیاں لانے کے نقصانات ٹھوس سائنسی سطح پر سامنے نہیں آئے لہٰذا ایسے کاموں کو جاری رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس طرح کے اور ایسے ہی امکانی طور پر دیگر نقصان دہ حالات میں محتاط روش اختیار کرنے کو بے پناہ عوامی حمایت حاصل ہے لیکن حکومتی سطح پر مخالفت کا سامنا ہے۔ شاید اس لیے کہ ایسے کسی امکان کو تسلیم کرلینا کمزوری کی علامت اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی خواہش تصور کیا جائے گا۔ اس کے برعکس مجھے اس بات کا یقین ہے کہ بظاہر یہ ہماری داخلی قوت اور عقل و بصیرت کا مظہر ہوگا۔

بظاہر اس امر کی سائنسی شہادت کے باوجود کہ ہم اپنے ماحولیات کو نقصان پہنچا رہے ہیں' ہم صورت حال کی اصلاح کے لیے کچھ زیادہ نہیں کر رہے' لیکن جب ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت بھی نہ ہو تو ظاہر ہے خطرات کی موجودگی کے باوجود ہم سے کچھ نہ ہو پائے گا۔ اس طرز عمل کی ایک وجہ یہ غالب رجحان بھی ہے جو حیات انسانی سمیت پورے عالم فطرت کو ایک میکانکی عمل سے زیادہ کا درجہ نہیں دیتا ہے۔ اگرچہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں فطرتی الٰہیات کے ماہرین مثلاً تھامس مارگن (Thomas Morgan) نے عالم فطرت کے کامل اتحاد' نظم' بصیرت اور ڈیزائن کی جانب توجہ دلائی تھی' لیکن برٹرینڈ رسل جیسے سائنس دانوں نے اس پورے تصور ہی کو نامعقول کہہ کر مسترد کر دیا۔ رسل نے لکھا: "میرے خیال میں یہ کائنات منتشر اجزا کا مجموعہ ہے جن میں بغیر کسی تسلسل' ہم آہنگی یا نظم کے اتھل پتھل جاری ہے"۔ سر جولین ہکسلے نے Creation --- A Modern Synthesis میں لکھا ہے: "جدید سائنس کو نظریۂ تخلیق یا خدائی رہنمائی کو مسترد کر دینا چاہیے"۔ لیکن آخر کیوں؟--- جیسا کہ برسٹل یونی ورسٹی کے پروفیسر ایلن لشن نے تحریر کیا ہے: "نظریۂ ارتقا انسانی ذہن کا وضع کردہ وہ تصور ہے جس میں کرۂ ارض پر زندگی کے وجود میں آنے اور تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کے عمل کی توجیہہ کسی خالق کے بغیر پیش کی گئی ہے"۔

کائنات میں کسی رہنما ہستی کو تسلیم کرنے سے ہمارا انکار یا اس میں کوتاہی کی وجہ سے عالم فطرت ہمارے لیے ایسا نظام ہو گیا ہے جس میں سہولت کی خاطر تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں' یا ایک ایسی جھنجھٹ ہے جس سے بچنے کے لیے تدابیر کی جائیں' اور جس میں رونما ہونے والے واقعات کا رخ ٹکنالوجی اور انسانی علم کی مدد سے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیں۔

فرٹزشمچر (Firtz Schamacher) نے اس نقطۂ نظر میں پنہاں خطرات کا ادراک کر کے ہی یہ کہا تھا کہ "سائنس دو طرح کی ہے: ایک تصرفات کی سائنس اور دوسری فہم و آگہی کی سائنس"۔ ٹکنالوجی کے اس عہد میں ہم اس حقیقت کو بڑی آسانی کے ساتھ فراموش کر چکے ہیں کہ بنی نوع انسان عالم فطرت کا حصہ ہے نہ کہ اس سے الگ کوئی چیز۔ اسی لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم جو کچھ بھی کریں وہ جوہر فطرت

(grain of nature) کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ جیسا کہ ماہر اقتصادیات ہرمن ڈلی (Herman Daly) نے نشاندہی کی ہے کہ عالم فطرت ہی وہ ماحول ہے جو معیشت کو حدود میں رکھتا ہے' اسے برقرار رکھتا ہے اور اس کی ضروریات پورا کرتا ہے' نہ کہ اس کے مخالف۔

ان میں سے آپ کے نزدیک کون سی دلیل غالب رہے گی؟--- ایک زندہ واحد دنیا' یا ایسی دنیا جو منتشر اجزا سے محض اتفاقاً وجود میں آگئی ہے اور اسی وجہ سے ترقی کے نام پر اس کا رخ جدھر چاہے موڑ دیا جائے تو وہ جائز ہوگا۔ میرے نزدیک اس سوال پر دیرپا ترقی کا حقیقی انحصار ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم از سرنو اپنے اندر عالم فطرت کے لیے احترام کے جذبات پیدا کریں' قطع نظر اس سے کہ یہ ہمیں فائدہ مند نظر آتا ہے یا نہیں۔ فلپ شیراڈ (Philip Sherrard) کے الفاظ میں: "ہمیں خدا' انسان اور کائنات کے درمیان باہمی تعلق کے بارے میں زیادہ آگاہ ہونا چاہیے"۔

سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمیں اس دانائی اور حکمت کا پورا احترام و لحاظ کرنا چاہیے جو عالم فطرت کے سارے نظام کے پس پردہ کارفرما ہے اور جو لاکھوں سال کے تجربات کی بھٹی میں کندن بنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم فطرت کے عمل کو سمجھنے کے لیے سائنس کا استعمال احتیاط سے کریں' نہ یہ کہ فطرت ہی کو بدل کر رکھ دیں' جیسا کہ جینیاتی انجینئری کے ذریعے حیاتیاتی ارتقا کے عمل کو ایک نیا روپ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

یہ نظریہ کہ کائنات کے مختلف اجزا ضبط و توازن کے ایک پیچیدہ نظام کے ذریعے منسلک ہیں' بڑی آسانی سے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ اب یہ غیر متعلقہ بات ہے' خواہ اس نظام میں بگاڑ پیدا کر کے ہم خود کو خطرے میں ڈالتے ہوں۔ چنانچہ اس عہد میں جب ہمیں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ سائنس کے پاس ہر چیز کا جواب موجود ہے' تو جوہر فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلنے کا بھلا کیا امکان ہے؟

جوہر فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کی ایک مثال میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ جینیاتی انجینئری کے ذریعے فصلوں کو ترقی دینے کے لیے جو سرمایہ لگایا جا رہا ہے' اگر اس کا معمولی سا حصہ بھی زراعت کے اس روایتی نظام کو سمجھنے اور اسے مزید مفید بنانے پر صرف کیا جائے جو آج تک وقت کی اہم تر آزمایش پر پورا اترا ہے' تو کہیں زیادہ بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ اس بات کی تو بہت زیادہ شہادتیں سامنے آ چکی ہیں کہ متنوع فصلوں کی کاشت میں زیادہ علم اور کم کیمیائی مرکبات کے استعمال سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب حقیقی طور پر قابل عمل طریقے ہیں' اگرچہ یہ ان طریقوں سے دور ہیں جو اس کلچر پر مبنی ہیں جس میں بڑے پیمانے پر تجارتی استحصال کو روا رکھا جا رہا ہے۔

ہمارے ممتاز ترین سائنس دانوں کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہماری دنیا میں بہت کچھ ہے جو ہم

ابھی نہیں جانتے۔ ہمیں ایسی بہت سی مخلوقات کے بارے میں بھی علم نہیں جو اسی کائنات میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ جیساکہ برطانیہ کے شاہی ماہر فلکیات سر مارٹن ریس کا کہنا ہے کہ: "اشیا کی پیچیدگی' نہ کہ ان کا سائز' انھیں سمجھنے میں مشکلات پیدا کرتی ہے"۔ انھوں نے یہ بات ایسی مثال سے سمجھائی ہے جسے صرف ایک ماہر فلکیات ہی پیش کر سکتا ہے۔ سر مارٹن کا کہنا ہے کہ: "ایک تتلی سے آگہی حاصل کرنا نظام کائنات کو سمجھنے سے زیادہ بڑا حوصلہ شکن علمی چیلنج ہے"۔ دوسرے سائنس دانوں نے' مثلاً ریچل کارسون (Rachel Carson) نے بڑی وضاحت سے ہمیں یاد دلایا: ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ گھاس کا ایک پتا کس طرح بنائیں؟ جب کہ سینٹ ماتھیو (St. Mathew) نے یہ اپنی بصیرت کی بنا پر کہا تھا: "سلیمان بھی اپنی تمام تر جاہ و حشمت کے ساتھ میدانوں میں کھلنے والے گل سوسن کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے"۔

جب اتنی نامعلوم باتوں کا سامنا ہو تو نظام فطرت میں اپنے مقام کے بارے میں عجز' تحیّر اور رعب کا احساس نہ ہونا مشکل ہے۔ یہ احساس قلب انسانی کی اس دانش سے جنم لیتا ہے جو ہم کو بعض وقت ہمارے باوجود ہم کو بتاتی ہے کہ ہم زندگی کے اسرار میں گرفتار ہیں اور ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب پالیں۔ پھر شاید اس کی ضرورت بھی نہیں کہ ہر سوال کا جواب ہمیں لازماً ملے' قبل اس کے کہ ہم تعین کریں کہ خاص خاص حالات میں ہمیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔

اسی حقیقت کو سترھویں صدی میں بلیس پاسکل (Blaise Pascal) نے یوں بیان کیا تھا: "یہ انسانی قلب ہے جو وجود خداوندی سے آشنائی کے تجربے سے گزرتا ہے نہ کہ عقل"۔ تو کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم میں سے ہر ایک کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں وہ وجدانی آگہی پائی جاتی ہے جس سے' اگر ہم اسے اجازت دیں' یہ قابل اعتماد رہنمائی ملے گی کہ ہماری سرگرمیاں کرۂ ارض اور ضروریات حیات کے طویل المیعاد مفاد میں ہیں یا نہیں؟

یہ آگہی' یہ قلب کی دانش' چاہے پتوں کی سرسراہٹ کی طرح دور دراز سرکی مدھم یاد سے زیادہ نہ ہو' لیکن ہمیں یہ یاد دلانے کے لیے کافی ہے کہ ہماری یہ زمین بڑی منفرد ہے اور اس کی دیکھ بھال ہمارا فرض ہے۔ دانش' ہمدردی اور رحم دلی ایسے اوصاف ہیں جن کا تجرباتی دنیا میں کوئی مقام نہیں' تاہم روایتی بصیرت یہ سوال ضرور اٹھاتی ہے: کیا ان اوصاف کو اپنائے بغیر ہم واقعی انسان ہیں؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ سقراط سے جب دانش کی تعریف کرنے کو کہا گیا تو اس نے اپنا نتیجہ فکر یہ پیش کیا: جب آپ کو اس بات کی معرفت حاصل ہو جائے کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔

میرے یہ کہنے کا کہ دیرپا ترقی کے حصول کے لیے ہمیں دل سے اٹھنے والی عقل سلیم کی جانب زیادہ متوجہ ہونا چاہیے' یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سائنسی تحقیق سے حاصل ہونے والی معلومات ہمارے لیے بنیادی

اہمیت نہیں رکھتیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ میرے نزدیک تو ضرورت اس بات کی ہے کہ قلب سے اٹھنے والی فطری بصیرت اور سائنسی تجزیے پر مبنی عقلی بصیرت میں توازن پیدا کیا جائے۔ ان دونوں میں سے اگر ایک کو نظرانداز کر کے محض دوسری پر انحصار کیا گیا تو کچھ حاصل نہیں ہوگا لہٰذا اپنے قلب و ذہن اور فطرت کے وجدانی اور عقلی، دونوں حصوں کو یکجا کر کے ہی اس مقدس عہد کا حق ادا کر سکیں گے، جو خالق کائنات یا رب (Sustainer) نے (جیسا کہ عہد قدیم میں خالق کو کہا جاتا تھا) ہمیں ودیعت کیا ہے۔ جیسا کہ گروہارلم برنڈلینڈ (Gro Harlem Brundiland) نے ہمیں توجہ دلائی ہے کہ دیرپا ترقی کا تعلق محض عالم فطرت کے ساتھ نہیں بلکہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ اس اصول کا اطلاق ہر طرح کی صورت حال پر ہوتا ہے، خواہ ہم ان لاتعداد لوگوں پر نظر دوڑائیں جنھیں مناسب غذا اور صاف پانی میسر نہیں یا وہ جو غربت زدہ ہیں اور بے روزگاری کا شکار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عالمگیریت اپنے جلو میں فوائد لے کر آئی ہے، لیکن خطرات بھی لائی ہے۔ سر جان براؤن نے اپنے "نظریۂ مربوط معیشت"--- یعنی ایسی معیشت جو اس سماجی اور ماحولیاتی حوالے کو تسلیم کرتی ہے جس کے اندر وہ روبہ عمل ہوتی ہے--- میں جس انکسار اور انسانیت کا اظہار کیا ہے، اس کے باوجود، یہ خدشہ پایا جاتا ہے کہ غریب ترین اور کمزور ترین عناصر ترقی سے نہ صرف بہت کم فائدہ اٹھائیں گے بلکہ اس سے بھی بدتر صورت حال سے دوچار ہو جائیں گے یعنی یہ کہ اپنے روزگار اور کلچر دونوں سے محروم ہو جائیں۔

لہٰذا، اگر ہم دیرپا ترقی کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آگے کی جانب بڑھنے کے لیے قدم اٹھائیں تو تاریخ کے سبق اہم ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ ایک ایسے عہد میں جب اکثر یہ محسوس ہوتا ہے اس وقت تک کسی بھی شے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی جب تک اس پر "ماڈرن" ہونے کی مہر نہ لگی ہو، ماضی کے سبق کا تذکرہ کرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ کیا یہ سبق ایک ایسے عہد میں سیکھے اور سکھائے جا سکتے ہیں جب علم کا اس طرح کا ذخیرہ منتقل کرنا "ترقی" کی راہ میں اکثر رکاوٹ گردانا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری آنے والی نسلوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کے علوم میں ہمارے حاشیہ خیال سے بھی زیادہ مہارت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن کیا ان کے اندر وہ بصیرت اور ضبط نفس بھی پیدا ہوگا جو اس مہارت کو، ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبق حاصل کر کے، حکمت کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ آیندہ نسلیں اس وقت تک اس سے محروم رہیں گی، جب تک زیادہ کوشش کے ساتھ تعلیم کے لیے وہ نقطۂ نظر وضع نہیں کر لیا جاتا، جس میں وجدان اور تعقل کا توازن پایا جاتا ہو۔ اس کے بغیر دیرپا ترقی کا خواب پریشان ہو کر رہ جائے گا۔ یہ محض ایسا بے معنی کھوکھلا منتر ہو جائے گا،

جسے مریضانہ طور پر بار بار پڑھا جائے تاکہ ہم اپنی حالت بہتر محسوس کریں۔

یقیناً ہماری سب سے بڑی ضرورت لوگوں کو تعلیم دینے میں ایسے توازن کو پیدا کرنا ہے' جس میں ماضی کی عملی اور وجدانی بصیرت کو آج کی ٹکنالوجی اور علوم کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا جائے کہ ایسی تعلیم کو حاصل کرنے والا انسان مرئی اور غیر مرئی' دونوں دنیاؤں کے شعور سے فیض یاب ہو جائے اور اس کی آگہی پورے کون و مکان کو اپنے احاطہ علم میں لینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔

مستقبل میں ہمیں ایسے افراد کار کی ضرورت ہے جو اس حقیقت سے آشنا ہوں کہ دیرپا ترقی محض' ٹکنالوجی کے مناسب اطلاق کا نام نہیں ہے۔ نہ اس چیز کا نام دیرپا ترقی ہے کہ انسانوں کا نقشہ بدل کر رکھ دیا جائے' اور نہ اس کو ترقی کہا جا سکتا ہے کہ حیاتیاتی انجینئری کے ذریعے عالم فطرت کو عالمگیر صنعتی ضروریات کے تحت بدلا جائے۔ بلکہ کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم عالم فطرت کے ساتھ دوبارہ منسلک ہو جائیں اور اس کی دیکھ بھال کا وہ گہرا فہم حاصل کریں جس کا طویل المیعاد بنیادوں پر ہمارا قائدانہ کردار تقاضا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے وسیع تر ماحول کو تباہی سے بچانے کے لیے ہمیں سیکولرزم اور روایتی مذہب کے درمیان تخریبی شگاف پر پل تعمیر کرنا ہوگا' اور اس کے لیے مادی اور روحانی دنیاؤں کی ایسی وحدت اور نظم کو دوبارہ دریافت کرنا ہوگا جیسا مربوط طب کی نامیاتی زراعت میں یا کسی عمارت کی تعمیر میں ہوتا ہے۔

میں وہ دن نہیں دیکھنا چاہتا جب ہمارے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں اٹھ کر ہم سے یہ سوال کریں کہ ہم نے اپنے قلوب کی بصیرت اور عقلی تجزیے کی دانش کی آواز کو کیوں نہیں سنا؟ ہم نے زندگی کے تنوع اور روایتی انسانی آبادیوں کے تحفظ پر زیادہ توجہ کیوں نہ دی؟ یا خلق کی رہنمائی کے حوالے سے اپنے کردار کے بارے میں زیادہ کھل کر کیوں نہیں سوچا؟

حیات انسانی کے بارے میں محتاط رویے کو اختیار کرنے یا اس کے اندر توازن حاصل کرنے کا کوئی شوقیہ متبادل نہیں۔ اگر دیرپا ترقی کا حصول مقصود ہے تو واحد راہ عمل یہی ہے۔

62

63

اخبار امت

جزائر ملاکا میں خونِ مسلم کی ارزانی

محمد ایوب منیر

عالم اسلام کے ایک سرے نائیجیریا سے عیسائی مسلم فسادات کے نام پر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی خبریں آتی ہیں تو دوسرے سرے انڈونیشیا سے بھی اس نوعیت کی خبروں کی کمی نہیں ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کی پیش گوئیاں کرنے والے شاید پیش گوئیوں کو سچا کر دکھانے پر عمل پیرا ہیں۔

انڈونیشیا کے جزائر ملاکا میں گذشتہ ڈیڑھ برس میں ۲۵ ہزار سے زائد افراد مذہبی بنیادوں پر قتل و غارت کا شکار ہو چکے ہیں۔ قتل کرنے والے اور مسلم آبادیوں اور قصبوں کو تاراج کرنے والے پروٹسٹنٹ مسیحی ہیں۔ ۵ لاکھ انسان ظلم و تشدد کی داستانوں کے ساتھ ہمسایہ صوبوں میں پناہ لے چکے ہیں۔ سب سے بڑی اسلامی مملکت میں مسلمان ہی نسل کشی' جبری انخلا اور اجتماعی عصمت دری کا شکار ہو رہے ہیں اور اس پر کہیں آہ و بکا بھی نہیں۔

۲۰ لاکھ کی آبادی والے اس علاقے میں پروٹسٹنٹ ۵۲ فی صد' مسلمان ۴۲ فی صد' کیتھولک ۵ فی صد اور ہندو وغیرہ ایک فی صد ہیں۔ ۱۰۲۷ جزائر پر مشتمل اس علاقے میں ۱۷ لاکھ ۶۵ ہزار مربع کلومیٹر سمندری رقبہ اور ایک لاکھ ۸۵ ہزار کلومیٹر زمینی رقبہ ہے۔

جکارتہ سے ملاکا کے دارالحکومت ایمبون کی فلائٹ تین گھنٹے کی ہے اور ارد گرد کے جزائر میں ایمبون سے سٹیمر پر پہنچنے میں عموماً ایک دن لگ جاتا ہے۔ ہالینڈ کی سرپرستی میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۰ء کو یہاں خود مختار ملاکا ریاست (RMS) کا اعلان کر دیا گیا تھا لیکن مسلمانوں نے اس کی توثیق نہ کی۔ جکارتہ میں غیر مستحکم حکومت کے قیام نے مسیحی علیحدگی پسندوں کو یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ مشرقی تیمور کے بعد ایک اور مسیحی ریاست کے قیام کو حتمی شکل دے دیں۔ عالم عیسائیت اور عالمی کلیسا پشت پر ہو تو کوئی بھی اقدام کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ سے پیوستہ عیدالفطر (۱۷ جنوری ۱۹۹۹ء) سے موجودہ خلفشار کا آغاز ہوا جس نے ہنگامے' بعدازاں فسادات اور چھوٹے پیمانے پر مسلمان مسیحی جنگ کی کیفیت اختیار کر لی۔

برطانیہ کے ماہنامہ امپیکٹ (اپریل ۲۰۰۰ء) نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح فسادات کا آغاز ہوا۔ کن علاقوں میں مسلمانوں پر تشدد کیا گیا' مسلمانوں کو کن علاقوں سے نکالا گیا اور ان کی املاک کو نذر آتش کیا گیا۔ پانچ ڈاکٹروں کی ڈائری کے اقتباسات پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سڑکوں پر مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی گئی' اِکا دکا مسلمان گھرانوں پر کتے چھوڑ دیے گئے تاکہ وہ اپنے گھربار چھوڑ کر جنگلوں یا ہمسایہ جزیروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں' مساجد کی دیوار کے ساتھ لگا کر مسلمانوں کو ذبح کیا گیا۔ توبیلو ضلع میں گولیلاوا گاؤں کی مسجد اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کی لاشوں کو جلا دیا گیا۔ عیسائیت قبول نہ کرنے والی عورتوں کو ٹرکوں میں بھر کر لاپتا کر دیا گیا' ان پر کیا گزر رہی ہے کوئی نہیں جانتا۔

اریان جایا اور پاپوا میں اہم ذمہ داریاں سرانجام دینے والے انڈونیشیا کی فوج کے بریگیڈیئر رستم کستور کا خیال ہے کہ مذہبی منافرت' اقتصادی کش مکش اور مرکزی حکومت کی عدم دل چسپی کے ساتھ ساتھ مسیحی علیحدگی پسند تحریک کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ جکارتہ سے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "ایمبون--- ملاکا میں' مسیحیوں اور آر ایم ایس کی مسلم دشمن سازشیں" میں بریگیڈیئر رستم کستور کہتے ہیں کہ ان فسادات کی منصوبہ بندی ۱۹۹۸ء میں ہوئی۔ انڈونیشیا کی آبادی میں غیر مسلم ۱۲ فی صد ہیں لیکن فوجی جرنیل اور انتظامیہ کے بڑے افسران کے طور پر عیسائی اہم کردار ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔

ملاکا کے کمانڈر جنرل میکس تامیلا مذہباً عیسائی ہیں۔ ظلم و تشدد' نسلی منافرت' اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کے ذمہ دار ہیں۔ ملاکا کے چھوٹے کمانڈروں کا خیال ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ برس میں جو فسادات' قتل عام' آتش زنی' لوٹ مار کے واقعات ہوئے ہیں وہ فوجی غفلت یا معاونت کے بغیر اتنی سنگین شکل اختیار نہ کرسکتے تھے۔ صدر اور نائب صدر ایمبون کی سڑکوں پر جس وقت کار دوڑا رہے تھے' عین ان لمحات میں بھی کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس وقت مہاجرین کی سب سے بڑی تعداد ترینٹ' سلاویسی اور دیگر ملحقہ جزائر میں ہے۔ امت مسلمہ کی بے بسی دیکھیے کہ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار اپنے ہی وطن میں بے گھر اور اجنبی ہیں۔ صدر کے غافلانہ رویے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جنرل ورانتو کے استعفا کے بعد بریگیڈیئر میکس تامیلا پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے کیونکہ فوج کے اندر عیسائی افسران اور جرنیل اہم علاقوں کے کمانڈر ہیں۔ نائب صدر میگاوتی جو انڈونیشیا جمہوری پارٹی کی سربراہ ہیں اور شورش زدہ ملاکا کے معاملات کی انچارج بنائی گئی ہے' ان کی جماعت میں غالب اکثریت مسیحی لیڈروں کی ہے اور گذشتہ انتخابات اکتوبر ۱۹۹۹ء میں اسکے نصف امیدوار مسیحی تھے۔ میگاوتی نے بھی میکس ماتیلا پر بھرپور اعتماد کیا ہوا ہے۔

دوسرے انڈونیشیائی صوبوں سے اس علاقے میں مسلمانوں کی امداد کے لیے آنے والے مسلم صحافیوں

اور گروہوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ تاہم نیوزویک کے نمایندے نے رپورٹ دی ہے کہ مسلمان اتنے وسیع علاقے میں منتشر ہیں کہ کوئی بھی منظم گروہ انھیں باآسانی زندگی سے محروم کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس اسلحہ بھی نہیں ہے اور وہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی طرح فوجی تربیت یافتہ بھی نہیں ہیں۔ درجنوں واقعات مہاجرین نے ایسے بیان کیے کہ فوجی انتظامیہ ان کے انخلا میں شریک رہی یا ان کی مدد کرنے میں ناکام رہی۔ پروٹسٹنٹ کلیسا' عالمی حمایت کے بغیر مسلم دشمن جنگ' ڈیڑھ سال تک جاری نہ رکھ سکا تھا۔ ملاکا کے چھوٹے علاقوں کے پادری کھلے عام اپنے آسٹریلوی مسیحی بھائیوں اور حکومت کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جو انھیں اسلحے اور مال کی کمک لگاتار پہنچا رہے ہیں۔ یورپین پارلیمنٹ نے انڈونیشیا کی حکومت کے خلاف قرارداد پاس کرلی ہے کہ وہ عیسائیوں کی مقدس جان و مال کی حفاظت نہیں کر رہی ہے (کاش یورپین پارلیمنٹ کشمیر' چیچنیا اور فلسطین کے بارے میں ایسی قراردادیں پاس کرنے کے اخلاق کا مظاہرہ کرتی!)۔ امریکہ چاہتا ہے کہ مشرقی تیمور میں امن و امان کی بحالی کے نام پر ملاکا کے قریب فوجی اور فضائی اڈے قائم کرے تاکہ انڈونیشیا پر اقتصادی گرفت کے بعد فوجی گرفت بھی مضبوط تر کرلی جائے۔

بریگیڈیئر جنرل کستور لکھتے ہیں کہ موجودہ فسادات سے بہت پہلے علیحدگی پسند تحریک آر ایم ایس نے جلوسوں میں آزادی کے نعرے بلند کیے۔ ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ۴۰ فی صد سے زائد مسلمان آبادی ہے جو انڈونیشیا کے وفاق سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی۔ گوریلا مسیحی گروہوں نے حکومت سے کئی بار مذاکرات کیے۔ صدر سہارتو' صدر یوسف حبیبی اور صدر عبدالرحمٰن واحد کی مشترکہ غلطی یہ رہی ہے کہ باغیوں اور ولندیزی فوج کے تربیت یافتہ آر ایم ایس گوریلوں سے ہتھیار رکھوانے کی کبھی کوشش نہ کی گئی' تب ہی انھیں یہ جرأت ہوئی کہ مشرقی تیمور کی طرح' جلد از جلد آزادی کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کا آغاز کر دیں۔

صدر سہارتو کے ۲۹ سالہ دور اقتدار میں فوج کو جو کھلی چھوٹ حاصل رہی اس کی بدولت میکس متیلا بھی اپنے آپ کو کسی کے آگے جواب دہ نہیں سمجھتا۔ ۱۷ ہزار انسانوں کی ہلاکت معمولی بات نہیں ہے لیکن افسوس کہ مسلم حکمرانوں' اسلامی ممالک کی حکومتوں اور مؤثر سیاسی گروہوں نے اس قتل عام پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا' نہ ہی حکومت جکارتہ کو اصلاح حال کی طرف توجہ دلائی۔

کیا امت مسلمہ کے حکمران' ان کی اسلامی ممالک کی تنظیم اور مسلم خبر رساں ادارے اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ وہ عالم عیسائیت کی دست برد سے ملاکا کے مسلمانوں کو بچانے کی آواز بھی بلند نہیں کر سکتے؟ اریان جایا' ملاکا کے معاملات کو زیادہ مستعدی سے حل نہ کیا گیا تو مسلم انڈونیشیا کا آیندہ جغرافیائی نقشہ تبدیل ہو سکتا ہے۔

66

گوجرانوالہ بورڈ سے الحاق شدہ

سبلائم گروپ اور علامہ اقبال فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام

سیدہ عائشہ گرلز سکول / کالج

ایک منفرد انگلش میڈیم اقامتی و ڈے اسکالر ادارہ

تعلیم بھی، تربیت بھی

چیئرمین
پروفیسر امین جاوید

- ششم تا نہم داخلہ جاری ہے
- فرسٹ ایئر کے لیے آئی سی ایس، ایف ایس سی کلاسز جاری ہیں
- فرسٹ ایئر کے لیے یکم جون 2000ء سے رجسٹریشن کا آغاز

تعارف

- ادارے کا اپنا جدید کیمپس اور کشادہ پلے گراؤنڈ
- قرآن، حدیث، سیرت طیبہ اور اسلامی لٹریچر کے ذریعے طالبات کی کردار سازی کا باقاعدہ نصاب
- مروجہ نصاب کے ذریعے میٹرک، ایف ایس سی اور آئی سی ایس کی تعلیم
- لائبریری، ہوم اکنامکس اور کمپیوٹر بطور مضمون
- کشادہ لائبریری، عمدہ کمپیوٹر لیب نیز فزکس، بیالوجی اور کیمسٹری لیبز کا اہتمام
- جدید سہولیات سے آراستہ ہاسٹل
- خوب صورت کشادہ آڈیٹوریم
- ہر شعبہ خوب صورت اور معیاری فرنیچر سے مزین
- ہر کمرے اور آفس کا مرکزی ساؤنڈ سسٹم سے رابطہ

آپ کی ایسی تمام آرزوئیں سیدہ عائشہ گرلز کالج نہایت عمدہ طریقے سے پوری کر سکتا ہے

آپ ایک دفعہ ضرور تشریف لائیے اور ادارے کا معائنہ کیجیے

تفصیلی معلومات کے لیے پراسپکٹس طلب فرمائیے

برائے رابطہ :

پرنسپل سیدہ عائشہ گرلز کالج نزد سبلائم چوک، کشمیر روڈ، سیالکوٹ فون : 552228 - 561537

پوسٹل ایڈریس : P.O. Box 76 سیالکوٹ فیکس : 0432-561537-550552

رسائل و مسائل

میڈیا کا مشرف بہ اسلام ہونا

سوال : آج کل میڈیا کے ذریعے قومیں بام عروج تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میڈیا معاشرے میں ڈش انٹینا' وی سی آر' ٹی وی' انٹرنیٹ' کیبل نیٹ ورک کی صورت میں موجود ہے' اس حوالے سے لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو میڈیا کے تمام ذرائع فوراً بند کر دیے جائیں گے جس طرح طالبان حکومت نے افغانستان میں بند کیے ہیں۔ مگر کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ میڈیا کو اسلامک میڈیا بنایا جا سکتا ہے۔

میری الجھن یہ ہے کہ آخر میڈیا کو ہم کس طرح اسلامک بنا سکتے ہیں؟ کیا ٹی وی پر مرد نہیں آئیں گے اور اگر آئیں گے تو کیا گھروں کے اندر عورتیں ٹی وی دیکھنے سے اجتناب کریں گی؟

براہ مہربانی میڈیا کو مکمل طور پر اسلامک میڈیا بنانے کے طریق کار پر کچھ روشنی ڈالیے۔

جواب : ۲۱ ویں صدی کے بارے میں بار بار یہ بات کہی جا رہی ہے کہ یہ معلومات کے بسرعت اثرانداز ہونے والی صدی ہے۔ اسی لیے انفارمیشن ٹکنالوجی' انٹرنیٹ اور میڈیا کے انقلاب کو اس صدی کا امتیاز قرار دیا جا رہا ہے۔ آپ نے اپنے سوال میں میڈیا کے ذریعے اقوام کے عروج تک پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا تعلق ان کے اخلاق و کردار' قوانین فطرت کو سمجھنے اور پیروی کرنے اور وقت اور قوت و محنت کے صحیح استعمال سے ہے۔ اس میں میڈیا کا کردار بلاشبہ اہمیت رکھتا ہے' لیکن تنہا میڈیا یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے کوئی قوم ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ امریکہ یا یورپ میں بیٹھا ہوا ایک شخص اگر صبح و شام سیٹلائٹ کے ذریعے سائنسی ترقی کی کہانی سنتا رہے اور خود کوئی حرکت نہ کرے تو معاشی اور سیاسی طور پر وہ جہاں تھا وہیں رہے گا۔ ہاں' اگر وہ سائنسی ترقیات سے آگاہی کے بعد اپنے ذہن کو استعمال کرتے ہوئے خود کوئی نئی راہ دریافت کرے گا یا کوئی ایجاد کرے گا تو یہ ایجاد اس کی معاشی ترقی کا باعث بن سکتی ہے۔

دوسری بات جو آپ نے سوال میں اٹھائی ہے' اس کا تعلق خود اسلام کے تصور معلومات اور تفریح و

تعلیم سے ہے۔ قرآن کریم نے انسانوں کی اخلاقی جواب دہی کے حوالے سے جو اصول بیان فرمایا ہے اس کا تعلق محض نظری معلومات سے نہیں ہے بلکہ وہ سماعت، بصارت اور فکر کے عملی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶) یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہونی ہے۔

گویا ہم جو کچھ سنتے ہیں، جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو نتائج غور و فکر کر کے (فواد) اخذ کرتے ہیں ان سب پر اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ آیت مبارکہ دعوت دیتی ہے کہ سماعت (audition)، بصارت (vision) اور فواد (cognition) کا صحیح اخلاقی استعمال کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ یہاں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ سماعت و بصارت کو چھٹی دے کر محض قیاس اور ظن و گمان کو رہنما بنا لیا جائے۔

بصارت کے صحیح استعمال کے لیے ان تمام علوم (sciences) میں کمال حاصل کرنا ہوگا جن کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہے۔ ساتھ ہی جو علم کتابی شکل میں پایا جاتا ہے اسے بھی حاصل کرنا ہوگا۔ اسی طرح سماعت کی جواب دہی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صرف ان معلومات کو کانوں کے ذریعے سے دل و دماغ تک پہنچنے دینا ہوگا جو مفید اور اخلاقی ہوں۔ ان دونوں ذرائع علم کو وحی الٰہی (قرآن و سنت) کی روشنی میں دل و دماغ کی تجربہ گاہ (laboratory) میں جانچ پرکھ کر جدید تحقیقات اور تخلیق علم کے عمل کو اختیار کرنا ہوگا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہی ایک شخص سمع و بصر و فواد کی مسئولیت کی ذمہ داری پوری کر سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد سوال کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں۔ میڈیا یا طباعتی اور کہربائی ذرائع ابلاغ پر اس وقت عملاً شیطان کا قبضہ ہے۔ اگر ہمیں عالمی حالات سے واقفیت حاصل کرنی ہو تو سی این این اور بی بی سی کی آنکھوں اور کانوں سے حالات کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔

تفریح کے لیے ہم سرحد پار کی اخلاق دشمن فلموں، گانوں اور عریاں ویڈیو پروگراموں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور خود ہمارا ٹی وی احساس کمتری کا شکار ہونے کے سبب سرحد پار کے پروگراموں کی نقل کو اپنی فن کاری سمجھتا ہے۔ اس صورت حال میں ایک حل تو یہ ہے کہ اگر آپ کے گھر میں ٹی وی یا وی سی آر ہے تو آپ دونوں کو زمین میں دفن کر دیں، اور خود کو یہ سمجھا لیں کہ آپ نے میڈیا کے شیطان کے خلاف جہاد کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے باوجود آپ کے پڑوس میں ڈش پر وہ سب کچھ آتا رہے گا جس سے بچنے کے لیے آپ نے اپنا ٹی وی اور وی سی آر زمین میں دفن کیا۔ اور خود آپ کے اپنے بچے اور پڑوس کے بچے شیطانی میڈیا سے متاثر ہوتے رہیں گے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ فنی کمال کے ساتھ متبادل پروگرام بنائیں جن میں ڈرامے بھی ہوں، نغمے بھی ہوں، دستاویزی پروگرام بھی ہوں، گویا

تعلیم و تفریح اور معلومات کو تعمیری اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ٹی وی اور ریڈیو پر نشر کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں یہ وہ طریقہ ہے جسے قرآن کریم نے یوں کہا ہے کہ "بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں" (ھود ۱۱:۱۱۴)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیطانی میڈیا کی جگہ اسلامی میڈیا میں کیا صرف تلاوت قرآن، درس حدیث اور تاریخ اسلامی کے اسباق، قوالیاں اور نیم لمبے، خشک اور نیند آور تقریریں ہی ہوں گی یا اسلامی میڈیا کے علم بردار فنی طور پر ایسی تخلیقی اور تعمیری دستاویزی فلمیں، ڈرامے اور نغمے پیش کر سکیں گے جو ناظرین اور سامعین کے لیے دل چسپ اور معلوماتی بھی ہوں؟

عملی طور پر بعض مسلم تنظیموں نے اس میدان میں کام کر کے ہمارے لیے بہت سہولت پیدا کر دی ہے۔ ترکی میں رفاہ پارٹی کے زیراثر نوجوانوں نے کارٹون، تاریخی شخصیات اور اخلاقی موضوعات پر بچوں اور بڑوں کے لیے ایک دو نہیں، بیسیوں ویڈیو پروگرام فنی مہارت کے ساتھ تیار کیے ہیں۔ ان میں سے بعض کو دیگر زبانوں میں dubb بھی کر دیا گیا ہے۔ شکاگو میں Sound Vision نامی ادارے نے بچوں کے لیے دل چسپ پروگرام اور کارٹون ویڈیو پر بنائے ہیں۔ یہ سب فنی لحاظ سے معیاری ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ جدید اور کلاسیکی موسیقی کو نظرانداز کر کے اور نیم عریاں خواتین کو ڈراموں اور نعت جیسے پروگراموں میں لائے بغیر بھی دل چسپ اور فنی لحاظ سے معیاری پروگرام بنائے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے جہاں اور جس حد تک تفریح کے ذرائع کو جائز قرار دیا ہے اسے بلاوجہ حرام قرار دیے بغیر ان کا استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً دف اور ڈھول کے استعمال کی کوئی ممانعت نہیں۔ چھوٹی بچیوں کے مل کر نغمہ گانے کا ذکر حدیث میں موجود ہے۔ اخوان المسلمون مصر نے امام حسن البنا کی قیادت میں ایک پورا شعبہ اسلامی ڈراموں اور نغموں کا بنایا تھا جو پورے عالم عربی میں مقبول ہوا۔ یاد رہے امام البنا کے والد عبدالرحمٰن البنا ایک مشہور محدث، اور امام البنا، خود جامعہ الازہر کے فارغ تھے۔ بلاشبہ اسلام لہوالحدیث کو حرام قرار دیتا ہے، موسیقی کی ممانعت کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ آلات موسیقی کے بغیر حسن صوت کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ مؤذن کے تقرر اور قرآن کریم کی تلاوت کے لیے حسن صوت پر زور دیتا ہے۔ حضورؐ، حضرت حسان بن ثابتؓ سے شعر سننا پسند فرماتے تھے۔ اگر توازن اور اعتدال قائم رکھتے ہوئے میڈیا کو اسلامی روایت کے فروغ کے لیے استعمال نہ کیا گیا تو شیطانی ثقافت ہماری نیک خواہشات، اور اس ثقافت کے لیے بددعاؤں کے باوجود ہمارے معاشرے کو تباہ اور ہماری اخلاقی بنیادوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

ثقافتی ابلاغ عامہ کی یلغار دور جدید کا ایک حربہ ہے۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ اس لیے ہمیں قرآن و سنت کی بنیاد پر اس میدان میں چیلنج قبول کرتے ہوئے جامد روایت پرستی سے آزاد ہو کر اسلامی اخلاق، حیا

اور طہارت کے دائرے میں رہتے ہوئے تجربات کرنے ہوں گے۔ اگر خلوص نیت کے ساتھ ایک وقت اور ضرر کو دور کرنے کے لیے اجتہاد کیا جائے' اور اس میں بالفرض غلطی بھی ہو جائے تو حدیث نبویؐ کی روشنی میں کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوگا بلکہ ایک اجر ہی مل جائے گا۔ اور اگر یہ اجتہاد' جس کی پوری امید ہے' درست ہو' تو ان شاء اللہ دہرا اجر ملے گا۔

مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کے بعد نہ تو ٹی وی بند ہوگا' نہ ریڈیو بلکہ دونوں مؤثر ذرائع کو اخلاقی' تعمیری اور معلوماتی پروگراموں کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ہمارے علاوہ جن ممالک میں اسلامی نظام لانے کی کوشش کی گئی ہے' مثلاً سوڈان اور ایران' کیا وہاں ٹی وی اور ریڈیو بند کر دیے گئے؟ یہ خیال بھی غلط ہے کہ ٹی وی پر کوئی مرد نظر نہیں آئے گا اور صرف انسانی سائے کام کرتے نظر آیا کریں گے۔ کیا حضور نبی کریمؐ نے سیدہ عائشہؓ کو ایک موقع پر اپنے شانہ مبارک پر سر رکھ کر حبشی کرتب کرنے والوں کے کرتب دیکھنے سے منع فرمایا تھا؟ بلاشبہ اسلام غض بصر کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کو دیتا ہے' لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ خواتین کسی بھی فرد کی طرف بغور نہیں دیکھ سکتیں؟ اگر یہ بات درست ہے تو کوئی خاتون بھی عقلاً کسی مرد کے بارے میں قانونی شہادت کی شرط پوری نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے شہادت کی بنیاد یقینی طور پر مشاہدے پر مبنی ہے۔ اسلام ان انتہاؤں کے درمیان ہے جن میں ہم پھنس کر رہ گئے ہیں۔ کسی مرد کو دیکھنے کے دوران نگاہوں کا اس کے بالوں یا چہرے میں الجھ کر رہ جانا اور اسے اپنا منظور نظر بنا لینا' اس کی تصویر کو اپنے کمرے میں لگانا' اس کے نام پر اپنی اولاد کا نام رکھنا' ان سب خلاف شرع افعال سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہوئے بھی ایک صالح' فطری مگر اخلاقی تصور تفریح میڈیا کے ذریعے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت نظری گفتگوؤں کی نہیں' عملاً ایسے پروگرام پیش کرنے کی ہے جن کو دیکھنے کے بعد ہمارے انتہائی محتاط فقہا بھی اپنی رائے میں نرمی پیدا کرنے پر آمادہ ہو جائیں (ڈاکٹر انیس احمد)۔

دعوت دین اور رکنیت جماعت

س: میری ایک ملنے والی جماعت اسلامی کی کارکن ہیں۔ انھیں امیدوار رکنیت کا فارم بھی دے دیا گیا ہے اور ان کی ساتھی خواتین بار بار ان سے پوچھتی رہتی ہیں کہ وہ کب امیدوار بنیں گی؟ مگر انھیں فارم پُر کرنے میں کچھ الجھن ہے۔ وہ جماعت کے پروگراموں میں شرکت کرتی ہیں' ماہوار رپورٹ بھی دیتی ہیں۔ اعانتیں جمع کرنا' تنظیمی پروگرام کی ذمہ داری اٹھانا' مہمات میں اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لینا جیسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ ان کے شوہر جماعت کے

متفق ہیں لیکن اگر ان کے علم میں آجائے کہ دن بھر کی تربیت گاہ ہے' جلسہ ہے' یا کوئی مظاہرہ ہے تو وہ سختی سے منع کر دیتے ہیں کہ ان میں شرکت کی ضرورت نہیں۔ درس قرآن' دعوت دین اور ملاقاتوں کی حد تک تو خواتین کو اجازت ہے مگر فرنٹ پر کام کرنا ضروری نہیں (مذہب اور سیاست الگ والی بات نہیں ہے)۔ اسی طرح کئی دفعہ اس بات پر بھی منع کر چکے ہیں کہ امیدوار یا رکن بننے کی بھی ضرورت نہیں۔

وہ گوشوارہ رکنیت پُر کرنا چاہتی ہیں مگر انھیں اس کی تمام شقوں سے اتفاق نہیں' خاص طور پر آخری شق سے۔ ان کا موقف ہے کہ اس فارم کی شرائط پر چونکہ عمل در آمد مشکل ہے اس لیے یہ دو رخی کی کیفیت اور دو رنگی ہے جو غلط ہے۔ دوسرے جماعت کے کچھ امیدوار اور ارکان جن سے ان کا تعلق رہا ہے' نہ تو وہ کارکن کی طرح جماعت سے مخلص ہیں' نہ ان کا اخلاق اس معیار کا ہے اور نہ وہ اس سرگرمی اور دل جمعی سے کام کرتے ہیں جس طرح ایک کارکن کام کرتا ہے۔ یہ بات بھی باعث عدم اطمینان ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کسی کے کام سے متفق ہونا' بھرپور حمایت کرنا' تحریکی کاموں میں آگے بڑھ کر عملاً حصہ لینا' اپنی حد تک سمع و اطاعت کا اہتمام کرنا' کیا یہ کسی جماعت سے مخلص ہونا نہیں؟ کیا فارم بھرے بغیر ہم نیکی کا ساتھ نہیں دے سکتے؟ کیا فارم اخلاص کی کسوٹی ہے کہ جو اسے پُر نہ کرے وہ جماعت سے مخلص نہیں؟ ان کے لیے الجھن یہ بھی ہے کہ وہ جماعت کو چھوڑنا نہیں چاہتی ہیں لیکن دوسری طرف وہ شوہر کے دباؤ میں بھی ہیں۔ کیا وہ یہ کام شوہر سے چھپ کر کر سکتی ہیں؟ کیا رکنیت کا فارم پُر کیے بغیر دعوت دین کا کام نہیں ہو سکتا؟

ج: مجھے اس بات پر بے حد خوشی ہے کہ آپ نے ایک عملی مسئلے کا ذکر اپنے خط میں کیا ہے۔ وضاحت کی غرض سے جواب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے کا تعلق امربالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت دین کے سلسلے میں ایک بیوی یا بیٹی کے لیے حدود اطاعت سے ہے۔ قرآن کریم اور سنت مطہرہ نے اس سلسلے میں واضح اصول یہ دیا ہے کہ اولاً ہر مسلمان مرد اور عورت پر دین کا سمجھنا اور اسے آگے پہنچانا فرض ہے۔ امت مسلمہ کا مقصد قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ "اب دنیا میں وہ بہترین امت تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" (آل عمرٰن ۳:۱۱۰)۔ ساتھ ہی ہمیں یہ اصول بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ جواب دہی کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ اور حدیث کی روشنی میں ایک خاتون اپنے گھر اور اپنی اولاد پر اتنی ہی مسئولیت رکھتی ہے جتنی ایک مرد پورے خاندان پر۔ ظاہر ہے یہ مسئولیت اس کے دائرہ

کار اور دیگر وظائف کے حوالے سے ہی ہو گی، مطلق نہیں ہو گی۔ اس لیے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد، ایک خاتون کو اپنے وظائف زوجگی اور فریضہ اقامت دین میں توازن برقرار رکھتے ہوئے یہ دعوتی کام کرنا ہو گا اور ترجیحات کا تعین کرنا ہو گا۔ ہر صورت حال میں غور کرنے کے بعد فیصلہ کرنا ہو گا کہ مقصد دعوت کہاں زیادہ صحیح طور پر حاصل ہو رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دعوت دین غیر معمولی طور پر ایک اجتہادی عمل ہے۔ اصول دین اور اصول فقہ کو صحیح طور پر سمجھے بغیر دعوتی کام یا تو ایک میکانکی عمل بن جاتا ہے یا بعض اوقات گھریلو زندگی میں کھچاؤ اور قانونی جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم نے شوہر کو اس کے گھر میں سربراہ ہونے کے سبب ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔ اس کی مثال کچھ ایسی ہے کہ ایک کالج یا یونی ورسٹی میں ۱۵ افراد گریڈ ۲۰ کے پروفیسر ہوں، اور ان میں سے ایک کو ادارے کا سربراہ بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے اس طرح وہ ۱۹ پروفیسروں سے ایک درجہ افضل ہو جائے گا، لیکن اپنے رفقا اساتذہ کی رائے، مشورہ، تجربہ، ہر چیز سے استفادہ کر کے ہی کوئی فیصلہ کرے گا اور ایک آمر کی طرح تکبر کا شکار نہیں ہو گا۔ جب تک وہ سربراہ ہے، بقیہ اساتذہ اس کی ہر حق بات کی اطاعت کریں گے اور ہر غلط بات پر نصیحت کریں گے۔ اور اگر بات قانون اور عقل کے بالکل منافی ہو تو اطاعت بھی نہیں کریں گے کیونکہ شریعت کا اصول ہے: لاطاعة المخلوق فی معصیة الخالق۔ اس لیے دعوتی مقاصد کے حصول کی اہمیت کو ایمان کی حد تک اہم ماننے کے باوجود، ایک بیوی یا بیٹی کو عموماً اپنے شوہر یا باپ کی جائز ہدایت کو اہمیت دینا ہو گی اور اس وقت تک دینا ہو گی جب تک اس کی ہدایت دین کے واضح اصولوں اور تعلیمات کے منافی نہ ہو۔

حضور نبی کریمؐ نے اسی بنا پر حضرت صفوان ابن معطلؓ کی اہلیہ محترمہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ نماز میں دو دو سورتیں پڑھنے کے بجائے ایک ہی سورت پڑھ لیں، اور نفل روزہ رکھنے میں شوہر کی ضرورت کا خیال رکھیں (ابوداود)۔ گویا قانونی رسہ کشی کی جگہ افہام و تفہیم اور محبت و نرمی اور دل کو ہاتھ میں لے لینے کی حکمت ہی حکمت دعوت ہے۔ جب بھی یہ شکل اختیار کی جائے گی شوہر یا باپ دعوت دین میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرے گا کہ اس کی بیوی یا بیٹی اپنے وقت، صلاحیت اور صحت کا صحیح استعمال کر رہی ہے اور اس تعاون پر وہ خود بھی اجر عظیم کا مستحق ہو جائے گا کہ اس نے اپنی بیوی کو اپنی ضرورت نظرانداز کر کے دعوت دین جیسی عبادت کرنے سے نہیں روکا۔ ہاں اگر شوہر یا باپ کسی معصیت کا حکم دے تو اس میں اطاعت و تعاون نہیں: ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان۔

دوسرا اہم پہلو آپ کے سوال میں یہ ہے کہ اگر ایک تحریکی کارکن وہ تمام ذمہ داریاں پوری کر رہی ہے جو ایک امیدوار رکنیت یا رکن سے متوقع ہوتی ہیں، لیکن دستوری طور پر باقاعدہ فارم بھر کر اور باقاعدہ

عہد اٹھا کر رکن بننے سے گریز کرے، تو دین میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ دیکھیے، دین شہادت حق کا نام ہے۔ یہ شہادت قولی بھی ہے اور عملی بھی۔ بغیر کسی معقول سبب کے اس میں تاخیر کرنا اپنے آپ کو اجتماعی برکات سے محروم رکھنا ہے۔ سورہ اٰل عمرٰن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم میں سے ایک جماعت (امت) ایسی ضرور ہونی چاہیے جو امربالمعروف کا کام کرے اور برائی سے روکے (۳:۱۰۴)۔ ایسے ہی اعتصام باللہ کے ذریعے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یک جا ہو کر منظم طور پر ایک نظم کے تحت ہی دین کے قیام کی جدوجہد کی جائے گی (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۳)۔ پھر احادیث نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ جب تین افراد سفر کے لیے چلیں تو ان کو چاہیے کہ اپنا نظام قائم کر لیں اور اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں (ابوداود عن ابوسعید خدریؓ)۔ یہی روایت حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے بھی ملتی ہے۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا: "جس طرح بکریوں کا دشمن بھیڑیا ہے اور ریوڑ سے الگ ہو جانے والی بکریوں کا بہ آسانی شکار کر لیتا ہے، اسی طرح شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، اگر جماعت بن کر نہ رہیں (فعليكم بالجماعة والعامة) تو یہ ان کو الگ الگ نہایت آسانی سے شکار کر لیتا ہے"۔ (مسند امام احمد، مشکوٰۃ)۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا "جو شخص جنت کے وسط میں اپنا گھر بنانا چاہتا ہو، اسے جماعت سے چمٹے رہنا چاہیے اس لیے کہ شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب وہ دو ہو جائیں تو وہ دور ہو جاتا ہے"۔ ان واضح اور مطلق ارشادات داعی اعظمؐ کی موجودگی میں کسی فرد کا ایک مناسب اسلامی تحریک کی موجودگی کے باوجود بغیر کسی عذر کے اس میں باقاعدہ شامل نہ ہونا لازمی طور پر خطرات کا باعث ہوگا۔ اس لیے اسلامی تحریکیں ہم خیال معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کو شمولیت کی دعوت دیتی ہیں۔ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو دلی خواہش، نیت اور کوشش کے باوجود کسی دینی حکمت یا عذر کے سبب شامل نہ ہو سکتے ہوں۔

دینی حکمت میں، میری ناقص رائے میں، وہ شکل بھی شامل ہے جس کا ذکر آپ نے خط میں کیا ہے۔ اگر ایک خاتون ہر لحاظ سے تحریک اسلامی سے وابستہ ہیں لیکن سربراہ خاندان اپنے اس منصب کی بنا پر اسے باضابطہ تحریک میں شمولیت سے روکتا ہے تو اس وقت تک صبر اور انتظار کریں جب تک وہ کشادہ دلی کے ساتھ ایسا کرنے کی اجازت نہ دے دے۔ اس سلسلے میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بہن کے شوہر کو توفیق عطا فرمائیں کہ وہ اپنی اہلیہ کو اجازت دے کر خود اعلیٰ اجر کے حق دار بن سکیں۔ یہ دعا آپ کو اور ہر تحریکی کارکن کو ایسے مواقع پر ضرور کرنی چاہیے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ دعاؤں کو قبولیت بخشتے ہیں۔

تیسرا اہم پہلو جس کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے وہ اصولی بھی ہے اور عملی بھی۔ اصولی طور پر کسی بھی جماعت بلکہ الجماعت میں بھی یہ کہنا کہ اس کا ہر کارکن، یا رکن، یا ذمہ دار مثالی شخصیت کا حامل

ہو گا، قرآن و سنت کی بصیرت کی روشنی میں درست نہیں۔ بلاشبہ اسلام اور اسلامی تحریک کی جدوجہد کا مقصد ایک مثالی اخلاقی اور اصلاحی معاشرہ اور حکومت کا قیام ہے، لیکن انسانی معاشرے میں انسانی کمزوریوں کا وجود فطری ہے۔ البتہ اس بنا پر نہ تو کمزوری کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے نہ معاف کیا جا سکتا ہے، بلکہ نیکی اور خیر کی تعلیم اور فروغ کے ذریعے صرف کم کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کے ۲۳ سالہ دور نزول میں جن سزاؤں اور اہل ایمان کی جن اقسام کو بیان کیا گیا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بہترین مثالی معاشرے اور ریاست میں بھی صالح افراد بعض اوقات شیطان کے وساوس میں آسکتے ہیں۔ ان تین صحابہؓ کا واقعہ جو غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر سکے گو وہ صداقت و ایمان کے اعلیٰ مقام پر تھے (التوبۃ ۹: ۱۱۷-۱۱۸)۔ سیدہ عائشہؓ پر بے بنیاد جھوٹ باندھنے کا ذکر قرآن کریم نے خود کیا ہے (النور ۲۴: ۱۱-۲۱)۔ میں مزید واقعات طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کر رہا لیکن اس طرف اشارے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں ۹۹.۹۹۹ فی صد بھلائی ہے اور ۰.۰۰۱ فی صد مواقع پر شیطان کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ معاشرہ اور وہ افراد فائزون میں ہوں گے یا خاسرون میں۔ اب چند لمحات کے لیے غور کیجیے، اپنے تمام تر دعووں کے باوجود کیا تحریکات اسلامی نے اپنے ہر کارکن اور رکن کو تربیت و آزمائش کی اس کٹھن وادی سے گزارا ہے جس سے صحابہ کرامؓ، جن میں سے ہر ایک ہمارے لیے دمکتا ستارہ ہے اور اسوہ حسنہؐ کی مثال ہے، گزرے تھے؟ کیا تحریکات اسلامی کا نظام تربیت اس نظام تربیت کے معیار تک پہنچ گیا ہے جو داعی اعظمؐ نے ہدایت ربانی اور فراست نبویؐ سے خود مرتب فرمایا تھا؟ اس لیے اگر کسی رکن یا ذمہ دار سے کسی کمزوری کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اسے نہ تو عیب جوئی کا ذریعہ اور موضوع بنائیں، نہ اس بنا پر ہمت ہار بیٹھیں کہ جب ارکان بھی کارکنوں سے پیچھے ہیں تو جماعت میں شمولیت کا کیا فائدہ؟ بالفرض آپ کا مشاہدہ درست بھی ہے تو کیا الدین نصیحۃ والی حدیث سے ارکان جماعت کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور کیا صرف امیر جماعت، امیر صوبہ، نائب امرا اور ارکان ہی کا استحقاق ہے کہ وہ دوسروں کو نصیحت کریں۔ حدیث کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر نصیحت امرا، قائدین اور سربراہوں کے لیے بھی ہے۔ اس لیے جب بھی کسی رکن یا ذمہ دار کی کوئی کمزوری علم میں آئے، نصیحت، ہمدردی، خیر خواہی اور اصلاح کے جذبے کے ساتھ فرد متعلق کو متوجہ کرنا سنت نبویؐ کی رو سے دین ہے اور فریضہ ہے۔

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ دعوت دین اور اقامت دین میں ہر کام باعث اجر ہے۔ ایک فرد کا اللہ کے دین کی اقامت کے لیے سیاسی مظاہرہ میں حصہ لینا ہو یا قیام اللیل کے دوران تلاوت قرآن، درس حدیث اور نوافل کا اہتمام یا بعض اوقات قیام اللیل میں شرکت کی خواہش کے باوجود ضعیف ماں یا علیل باپ یا بیوی کی تیمارداری کرنے کی بنا پر ایسے پروگرام میں شرکت نہ کر سکنا، ان میں سے ہر ایک کا اجر نصوص سے

ثابت ہے۔ اس لیے اگر ایک شوہر یا باپ کسی معقول وجہ کی بنا پر اپنی بیوی یا بیٹی کو مظاہرے میں جانے سے روکے تو مظاہرہ میں شرکت کی نیت کا اجر تو بہرصورت ملے گا ہی۔ ساتھ ہی کوشش کی جائے کہ شوہر یا باپ کو نرمی و محبت سے اس کام کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے۔ دین کی دعوت صبر اور ثبات کے ساتھ کام کرتے رہنے کا نام ہے۔ یہ شرط نہیں ہے کہ ہر خواہش اور ہر فریضہ ایک ہی فرد پورا کرے۔ جتنا بوجھ ایک نفس اٹھا سکتا ہے اور جس کام کو بحسن و خوبی کر سکتا ہے' اسی کے لیے وہ جواب دہی اور اجر کا مستحق ہے۔

جہاں تک سوال کسی فرد کی نیت اور اس کے دل کے حال کا ہے' کسی کے اخلاص کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کے دل کے اندر جھانک کر بچشم خود مشاہدہ ضروری ہے اور میری معلومات کی حد تک ہم میں سے اکثر افراد یہ صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے کسی انسانی کمزوری کی بنا پر generalization یا ایک عمومی رائے قائم کر لینا کہ ایک فرد سے غلطی ہوئی ہے تو سب افراد ہی ایسے ہوں گے' کے بجائے مثبت طور پر مشورہ' نصیحت اور اصلاح کے رویے کو اختیار کرنا دینی حکمت سے زیادہ قریب ہوگا (ا-ا)۔

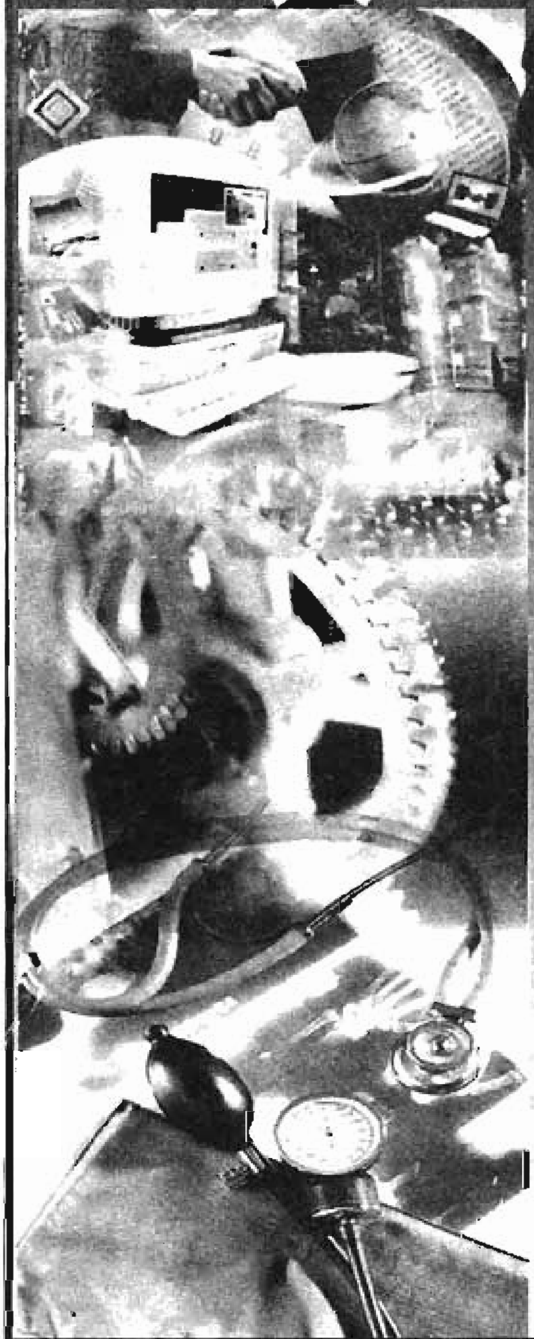
بہترین تدریس، پرسکون ماحول، شاندار مستقبل

پنجاب کے علاوہ سندھ، سرحد، بلوچستان
آزاد کشمیر اور بیرون ملک کے طلبہ زیر تعلیم ہیں
جن کے قیام وطعام کیلئے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے

سابقہ امتحانات میں بہترین نتائج کا ریکارڈ

لاہور بورڈ سے الحاق شدہ

منصورہ ماڈل ڈگری کالج



داخلہ سال اول

- **F.Sc** Pre.Med./ Eng.
- **I.C.S**
- **F.A**
- **I.Com**
- **Gen. Sec**

- اعلیٰ قابلیت کے حامل تجربہ کار اساتذہ
- کشادہ شاندار کیمپس
- کھیل کے میدان
- انگریزی اور سائنسی مضامین پر خصوصی توجہ
- پریکٹیکلز کے لئے تمام سہولتوں سے آراستہ لیبارٹریز
- 650 سے زائد نمبر والے طلبہ کو ماہانہ 600 روپے سکالرشپ

منصورہ ماڈل ڈگری کالج
وحدت روڈ لاہور

فون: 5420428
5419324

/ ۱

کتاب نما

تحقیقات و تاثرات' ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی۔ ناشر: ادارہ علم و فن' ۱۰۸- بی الفلاح' ملیر ہالٹ کراچی ۷۵۲۱۰۔ صفحات: ۵۲۸۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

زیر نظر کتاب میں پانچ عنوانات (تاریخ و سیاست' شخصیات و سوانح' تجزیہ و تنقید' دینی افکار' ذاتیات) کے تحت مرتب شدہ بیشتر مقالات و مضامین' تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ مصنف ایک طویل عرصے تک تعلیم و تدریس کے سلسلے میں متعدد عرب ممالک میں مقیم رہے۔ پھر ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں کیمبرج یونی ورسٹی میں کچھ وقت گزارا۔ عربی زبان پر دسترس کے ساتھ ساتھ تاریخ اور مذہب کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ ایک باشعور عالم کی طرح انھیں عصری اور سیاسی مسائل سے بھی خصوصی دل چسپی ہے۔ ان کی نہاد و افتاد تحقیقی ہے۔ چنانچہ موضوع کچھ بھی ہو' وہ ایک تحقیق کار کی طرح موضوع کو اس کی جزئیات کے ساتھ اور بڑی باریک بینی سے دیکھتے اور پھر معقول شواہد کی روشنی میں نتائج اخذ کرتے ہیں۔

''بوسنیا ماضی و حال'' کے تاریخی و سیاسی جائزے میں انھوں نے بتایا ہے کہ اہل بوسنیا اس سرزمین کے اصل باشندے (son of the soil) ہیں۔ یہاں پرچم اسلام عثمانی ترکوں نے پہنچایا تھا۔ یہاں کی تاریخ مشرقی یورپ میں تہذیب و تمدن' عدل و انصاف' رواداری' انسانی خدمت اور تعمیر و ترقی کی ایک طویل داستان ہے۔ اہل بوسنیا نے اقوام متحدہ کے مشورے اور تائید کے بعد ہی' اپنے یہاں ریفرنڈم کرایا تھا جس میں ۶۳.۶۸ فی صد لوگوں نے یوگوسلاویہ سے آزادی کے حق میں رائے دی اور اقوام متحدہ نے اسے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اپنا ممبر تسلیم کر لیا مگر سیکرٹری جنرل کا رویہ غیر عادلانہ' غیر انسانی اور ظالمانہ رہا کیونکہ وہ خود ایک قبطی عیسائی اور ایک یہودی بیوی کے شوہر ہیں۔ چیچنیا کے بارے میں رضوان علی ندوی صاحب نے بتایا ہے کہ اگرچہ روس نے اپنے استعماری مقاصد و مفادات کے تحت قوقاز یا قفقاز کے علاقے کو آٹھ الگ الگ جمہوریتوں میں تقسیم کر دیا تھا مگر اس علاقے میں عربی اور ترکی اسلامی ثقافت کا گہرا اثر رہا ہے۔ یہاں اشتراکی تسلط سے قبل تک عربی و فارسی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ مغربی علاقے میں ترکی زبان دوسری بڑی زبان تھی۔ روسی کمیونسٹوں نے بڑے پیمانے پر روسیوں کو یہاں لا لا کر آباد کیا۔ مسلمانوں کا تناسب پہلے ۹۰ فی صد تھا' ۱۹۷۹ء میں گھٹ کر ۶۸ فی صد رہ گیا۔ پہلے یہاں عربی رسم الخط رائج تھا' اسے روسی رسم

الخط سے بدل دیا گیا۔ یہ سرسبز و شاداب اور تیل کی دولت سے مالا مال خطہ روس کے لیے "سونے کی ایک چڑیا" کی حیثیت رکھتا تھا۔ روس کی ساری جبریت اور لادینیت کے پرچار کے باوجود اس علاقے کے لوگوں کے دلوں سے جذبہ حریت کو مٹانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اسٹالن نے چیچنیا کی تمام مسلم آبادی کو سائبیریا کے برفانی اور صحرائی علاقوں میں جلاوطن کر دیا۔ جب اسٹالن مرگیا' تب مہاجرین میں سے بچے کھچے لوگوں کو وطن واپس آنے کی اجازت ملی لیکن اس ہجرت سے ان کے اسلامی عقیدے میں اور پختگی پیدا ہوئی۔ ۱۹۹۱ء میں چیچنیا نے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ اس وقت روس انتہائی بدحال تھا اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ چیچنیا کے خلاف لڑ سکے لیکن جب ماسکو کی حکومت امریکی مالی امداد کی وجہ سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی تو سب سے پہلے اس نے حزب مخالف کے لیڈر عمر اختر خانوف کو اپنا آلہ کار بنانے کے لیے ۱۰ بلین روبل کی خطیر رقم دی تاکہ وہ اس کو صدر دودائف کی حکومت کے خلاف استعمال کرے اور اس کو غیر مستحکم کر کے ملک میں بے چینی پھیلائے۔ چیچنیا کی آزاد مملکت کے خلاف اور بھی بہت سے اقتصادی حربے استعمال کیے گئے مگر چیچنیا کے جان باز اور حریت پسند' روسیوں کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر ہم زندہ رہے تو خوش حالی کی زندگی بسر کریں گے اور اگر مر گئے تو اللہ کے حضور میں ہوں گے اور خوش نصیب ہوں گے۔

لاہور اور کراچی پر مضامین خالصتاً تحقیقی ہیں۔ تحقیق و تدقیق کا یہ انداز قریب قریب سارے مضامین میں نمایاں ہے۔ ایک مضمون میں معروف مورخ طبری پر شیعیت کے الزام کی تردید کی ہے۔ اسی طرح تاریخ اسلام سے متعلق متعدد شخصیات اور بزرگوں (امام شافعی' سید عبداللہ شاہ غازی' ابن تیمیہ وغیرہ) کے احوال و سوانح کے متعلق ندوی صاحب نے حقائق و اوہام کو الگ الگ کیا ہے۔ ندوی صاحب کے متعدد مضامین بعض اہل قلم کی بے احتیاطیوں یا ناکافی اور سرسری معلومات کی تردید اور اصل حقائق کی نقاب کشائی کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے اخبارات و رسائل کے چند معروف کالم نگاروں پر خوب خوب نقد و جرح کی ہے۔ عمران خان کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی بدگمانیوں کی وہ تردید کرتے ہیں۔ ایک مضمون میں نفحۃ العرب (مولانا محمد اعزاز علی) کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح ایک اور مضمون میں خطبات حرم (ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی) پر کڑی گرفت کی ہے۔

ندوی صاحب کے دائرہ تحقیق میں تنوع بھی ہے اور رنگا رنگی بھی۔ چند عنوانات مباحث دیکھیے: ڈاکٹر اسرار احمد' مسئلہ کشمیر اور درس مفاہمت۔ اسلام میں عورت کی حکمرانی۔ سیدنا عثمانؓ کا قرآن کہاں ہے؟ استنبول و اسلام بول۔ خاندانی منصوبہ بندی' شریعت اور قاہرہ کانفرنس۔ مصنف اس بات کے قائل ہیں کہ علمی اور تاریخی موضوعات پر لکھتے ہوئے حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خود بہت باریک بین ہیں

مثلاً معروف قرآنی آیت وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کو بہت سے لوگ "و" کے بغیر لکھ دیتے ہیں۔ ندوی صاحب کہتے ہیں' اس "و" کو باقی رکھنا ضروری ہے کہ عربی زبان کا یہی انداز ہے اور جو لوگ عربی زبان سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں اور کبھی کوئی آیت یا قرآنی جملہ لکھتے وقت اس واو استئناف کو حذف نہیں کرتے۔ ایک اور جگہ انھوں نے بتایا ہے کہ سعودی عرب کے ایک ساحلی ملک کو اردو صحافت میں غلط طور پر "اومان" لکھا جاتا ہے' اصل میں یہ عُمَانْ ہے۔ (ع پر پیش اور بغیر تشدید کے 'م کے ساتھ)۔ یہ اردن کے پایۂ تخت سے جدا ہے۔ اگرچہ دونوں کا املا ایک ہے لیکن تلفظ میں فرق ہے۔

آخری حصے کے چار مضامین میں سے ایک "دمشق سے کیمبرج تک" تو سفرنامہ ہے اور تین مضامین بعض شخصیات (ڈاکٹر طٰہٰ حسین' ڈاکٹر محمد حمیداللہ اور ماہرالقادری) سے ملاقاتوں کی یادداشتوں اور ان کے بارے میں مصنف کے تاثرات و نقوش پر مشتمل ہیں۔ "دمشق سے کیمبرج تک" میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ کا تفصیلی ذکر آیا۔ پھر مابعد مضمون میں بھی انھی باتوں کی تکرار ہے جسے حذف کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے یہ سوانحی یا شخصی مضمون بہت دلچسپ ہیں اور ان میں عام قاری کے لیے بھی ایک لطف اور کشش موجود ہے۔

مصنف موصوف نے مشرق و مغرب کے بلند پایہ علمی اداروں اور جامعات سے تعلیم حاصل کی۔ ربع صدی سے زائد عرصہ عرب ممالک میں گزارا۔ چوٹی کے عرب علما' ادبا اور ناموران دین و سیاست کی صحبت اٹھائی۔ اسی طرح کیمبرج یونی ورسٹی کے فضلا سے اکتساب علم و تحقیق کیا۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں ایک بلند نگہی ' خالص علمی رویہ' ذہنی کشادگی' جرأت و صاف گوئی اور دینی و اخلاقی حمیت موجود ہے۔ ان کے اسلوب میں کسی طرح کا ابہام یا الجھاؤ نہیں ہے۔ دینی موضوعات پر لکھنے والوں میں بہت کم لوگ ایسی واضح' صاف اور صریح نثر لکھنے پر قادر ہیں۔ ندوی صاحب کا یہ مجموعہ مضامین' امید واثق ہے کہ باذوق قارئین کے لیے معلومات افزا رہے گا (رفیع الدین ہاشمی)۔

تفسیر قرآن کے اصول' امام حمید الدین فراہی۔ ترتیب و ترجمہ: خالد مسعود۔ ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث' رحمان سٹریٹ' مسلم روڈ' سمن آباد' لاہور۔ صفحات: ۲۲۸۔ قیمت: ۸۰ روپے۔

اپنی جوانی کے ایام میں مجموعہ تفاسیر فراہی کے نام سے آخری پارے کی چودہ سورتوں کی تفسیر نے غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا اور مولانا امین احسن اصلاحی کے واسطے سے امام حمیدالدین فراہی کے نام سے آگاہی ہوئی تھی۔ چند برس قبل بھارت میں مولانا فراہی کی فکر پر ایک کئی روزہ سیمینار ہوا۔ تفسیر کے میدان میں ان کی غیر معمولی خدمات ہیں۔ مولانا اصلاحی کی تدبر قرآن کو ان کے استاد کی فکر کا پرتو کہا جاتا

ہے۔ مولانا فراہی عربی میں لکھتے تھے۔ ان کے پیش نظر علما تھے۔ اب یہ پورا میدان باقی ہے کہ ان کی تصنیفات کو اردو زبان میں مرتب کیا جائے۔

زیر نظر کتاب میں خالد مسعود صاحب نے رسائل الامام الفراہی اور مقدمہ نظام القرآن کے متعلقہ حصوں کو ایک مربوط تصنیف میں پیش کیا ہے۔ رسائل کا ترجمہ انھوں نے خود کیا ہے اور مقدمے کا ترجمہ مولانا اصلاحی کا لیا ہے۔

اصول تفسیر پر اردو میں کوئی جامع کتاب موجود نہیں ہے۔ تفہیم القرآن کا آغاز کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کے سامنے روایتی تفسیر لکھنا نہیں تھا، اسی لیے انھوں نے مقدمے میں تفسیر کے بجائے قرآن فہمی کے اساسی اصول بیان کیے جو قرآن کے مرکزی موضوع اور بنیادی تصورات کی تفہیم کے لیے کلید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان میں شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر دستیاب ہے جو ایم اے کے طلبہ نصاب میں پڑھتے ہیں۔ اب حمیدالدین فراہیؒ کی یہ کتاب تفسیر پر ایک بنیادی کتاب کی حیثیت سے سامنے آئی ہے۔

فراہی صاحب کی فکر میں نظم قرآن کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں بعض اوقات وہ اتنی دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ انھوں نے پورے قرآن کو ایک مربوط کتاب کی حیثیت سے سمجھا اور پیش کیا ہے۔ سورت کا سورت سے ربط ہے، آیات کا آیات سے باہمی ربط ہے۔ ہر سورت کا ایک عمود ہے جس کے گرد سارے مضامین گھومتے ہیں۔ ہر آیت اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ آخر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ذی شان ہے!

اس مختصر تبصرے میں اس کتاب کے تمام مضامین کا جائزہ ممکن نہیں۔ اختصار سے سمجھانے والے انداز میں تفسیر کے مختلف اصول مثالوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اگر قرآن کا کوئی طالب علم درسی کتب کی طرح سبقاً سبقاً پڑھے تو اس کے ہاتھ فہم قرآن کی بہت سی کلیدیں آ جائیں گی، ذہن وسیع ہوگا اور قرآنی مضامین پر شرح صدر اور اطمینان قلب نصیب ہوگا۔ ہمارے عربی مدارس کے نصاب میں اگر مسلکی تعصب سے بالا ہو کر قرآن کے مطالعے کو اہمیت دی جائے تو اس طرح کی کتب اس مطالعے کے لیے بنیاد کا کام دے سکتی ہیں (**مسلم سجاد**)۔

تاریخ علوم اسلامیہ، محمد فواد سزگین۔ مترجم: پروفیسر شیخ نذیر حسین۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامیہ، منصورہ، لاہور - ۵۴۵۷۰۔ صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: درج نہیں۔

محمد فواد سزگین عصر حاضر کے نامور ترک محقق اور عالم ہیں۔ علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت جرمن یونی ورسٹیوں میں ہوئی۔ یوں تو انھوں نے بہت سے علمی کارنامے انجام دیے مگر

تاریخ التراث العربی (تاریخ میراث عربی) ان کا شہرۂ آفاق علمی کارنامہ ہے جسے ۸ جلدوں میں لائیڈن سے شائع کیا گیا۔ پھر اس کے بعض حصوں کا عربی ترجمہ جامعہ امام محمد بن سعود، ریاض سے شائع ہوا (ابھی ترجمے کا کام جاری ہے)۔ دراصل یہ معروف جرمن مستشرق کارل بروکلمان کی ۴۰ برس کی محنت سے تیار کردہ تاریخ ادبیات عربی کی نئی اور نظرثانی شدہ صورت ہے۔ سزگین نے اس کام پر ۱۵، ۲۰ برس صرف کیے۔ ان کا یہ کام بروکلمان کی اصل تاریخ پر اس لیے فوقیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اس کی غلطیوں کی تصحیح کے ساتھ ساتھ اس میں بہت سے اضافے بھی کیے ہیں۔ سزگین صاحب جرمنی میں مقیم ہیں اور اب بھی تحقیق میں مصروف ہیں۔

سزگین کی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں علوم قرآن، حدیث، فقہ، تصرف، عہد جاہلیت، صدر اسلام، بنوامیہ، بنی عباس کے شعرا اور ان کے فکروفن، علم طب، کیمیا، نباتات، زراعت، ریاضیات، فلکیات، لغت، علم نحو وغیرہ وغیرہ پر مسلم علما کی کتابوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تحقیقی کام مصنف کی وسعت معلومات اور اسلامی عربی علوم سے ان کی گہری واقفیت اور اپنے موضوع سے ایک جذباتی لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ استنبول کے کتب خانوں میں موجود مخطوطات کے خزانوں سے سزگین نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے کام کے پھیلاؤ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے معروف عربی شاعر، متنبی کے دیوان کی ۴۰ شرحوں کی تفصیل دی ہے، اس کی شاعری اور مدح و قدح پر لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر اس کے علاوہ ہے۔ سزگین کی کتابیات مسلمانوں کی عظیم الشان عالمانہ کاوشوں کی ایک جھلک پیش کرتی ہے (انھوں نے ۴۳۶ ہجری تک کے مخطوطات تک اپنی تحقیق محدود رکھی ہے)۔

عربی زبان و ادب کے معروف محقق شیخ نذیر حسین صاحب نے علوم فقہ سے متعلق سزگین صاحب کی جلد کے ایک حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ شروع میں انھوں نے سزگین صاحب کی شخصیت اور ان کے متذکرہ بالا علمی کارنامے کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ بعدازاں علم فقہ سے متعلق سزگین کا مقدمہ ہے اور پھر عہد بہ عہد کتب فقہ کی تفصیل، کتب فقہ کا تذکرہ اور ان کے مصنف فقہا کا تعارف دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ و تعارف اموی، عباسی، پھر مالکی، شافعی اور حنبلی، شیعی، زیدی، اسماعیلی، قرامطی، نصیری اور اباضی فقہوں کے لحاظ سے ہے۔

دراصل یہ کتاب مسلمانوں کے ہمہ جہت اور ہمہ گیر علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے علمی انہماک کی معمولی سی جھلک پیش کرتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں نے اپنے آبا سے حاصل ہونے والی علمی میراث کو نظرانداز کر رکھا ہے مگر انھیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ اپنے علمی ورثے کو سمجھے بغیر، اور روز بروز وسعت پذیر علوم و افکار پر توجہ دیے بغیر وہ ترقی نہیں کر سکتے اور اقوام عالم

کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تحقیق و تصنیف سے بے نیاز رہتے ہوئے' عروج اور عظمت رفتہ کی بحالی محض ایک خواب و خیال کی حیثیت رکھتی ہے (ر-ہ)۔

ماہنامہ **حجاب** رام پور' مدیرہ: ام صہیب۔ نگران: ڈاکٹر ابن فرید۔ پتا: ماہنامہ حجاب' بیت الصالحہ' زینہ عنایت خاں' رام پور-۲۴۴۹۰۱' یوپی' بھارت۔ قیمت: ۱۲ روپے۔ سالانہ چندہ: ۱۴۰ روپے۔

"خواتین اور طالبات کا رسالہ" اس اعتبار سے قابل توجہ ہے کہ دور حاضر کے معاشروں میں طبقہ نسواں کو طرح طرح کے فریبوں اور چال بازیوں کے ذریعے بیچ بازار لاکھڑا کر کے' اس کی ذلت اور رسوائی کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے' یہ رسالہ ایک ولولے سے اس کے خلاف ایک جہاد مسلسل میں معروف ہے۔ گو اس کے وسائل محدود ہیں اور اسے استحصالی طبقوں کی طرح حکومتوں' اداروں اور کسی این جی او کی سرپرستی یا تائید حاصل نہیں ہے' اس کے باوجود یہ بڑے سلیقے سے اپنی سی کاوش میں مصروف عمل ہے۔ حالات بے حد ناسازگار ہیں (ہوا ہے گو تند و تیز) لیکن یہ اپنا چراغ جلائے ہوئے ہے۔ اس رسالے کو معروف اردو ادیب (افسانہ نگار اور نقاد) جناب ابن فرید کی سرپرستی حاصل ہے۔ چنانچہ حجاب کی نظم و نثر کا ایک معیار ہے اور اس کی تحریروں میں ایک ادیبانہ پختگی نظر آتی ہے (حالانکہ خواتین کے عام رسالوں میں ایک طرح کی ناپختگی ہوتی ہے)۔

حجاب میں بڑا تنوع ہے: حمد' نعت' مطالعۂ قرآن' تذکرۂ حدیث' سیرت صحابہؓ' افسانہ' غزل' طبی مشورے اور کھانے پکانے کی تجاویز اور طریقے وغیرہ۔ اس میں قبول اسلام کی چشم کشا داستانیں اور ایمان افروز واقعات بھی ایک تسلسل کے ساتھ دیے جا رہے ہیں بلکہ حجاب نے ایک بڑا دلچسپ "مغربی نومسلم خواتین نمبر" بھی شائع کیا ہے۔ رسالہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ خاندانی نظام اور اس کا استحکام ہی معاشرے کی بقا کی ضمانت ہے اور خاندان کی تشکیل میں عورت کا کردار مرکزی اور اساسی ہے۔ مغرب کا سارا زور اس بات پر ہے کہ عریاں اور مادر پدر آزاد تہذیب کے ذریعے خاندانی نظام کا تار و پود بکھیر دیا جائے تاکہ مشرقی اور اسلامی معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں اور اس طرح اسے آسانی سے منہدم کر دیا جائے۔ حجاب نے اسی سلسلے میں "خاندانی نظام نمبر" بھی شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی خاص نمبر (حقوق نسواں نمبر' آزادی نسواں نمبر' مظلوم عورت نمبر اور تسلیم نسواں نمبر) بھی شائع کیے ہیں۔

مختصر یہ کہ حجاب قاری کی معلومات میں اضافہ بھی کرتا ہے اور اس کے اخلاقی اور انسانی جذبات کو بیدار اور توانا بھی کرتا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ اپنے ایمان اور یقین میں اضافہ محسوس کریں گے (ر-ہ)۔

The Ahmadiyya Movement: British - Jewish Connections

بشیر احمد۔ ناشر: اسلامک اسٹڈی فورم' پوسٹ بکس ۱۲۷۵' راولپنڈی۔ صفحات: ۵۷۵' مع اشاریہ و کتابیات۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

حق و باطل کی کش مکش میں باطل قوتیں ایک دوسرے کی مدد میں سرگرم کار دکھائی دیتی ہیں' دوسری جانب وہ مسلم دنیا کے اتحاد کو ہدف بنانے کے لیے پُرجوش کوششوں میں مصروف ہوتی ہیں۔ یہ کام عبداللہ بن ابی اور عبداللہ بن صباح سے شروع ہوا' اور اس عہد تک آیا۔ ان باطل قوتوں کے لیے اسلام کا سب سے زیادہ پریشان کن پہلو تصور جہاد اور تصور امہ ہے۔ اسی لیے یہود و ہنود اور نصاریٰ نے ان دو پہلوؤں کو ہدف بنانے کے لیے قرآن' سیرت اور اسلامی معاشرت کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بنایا۔ جب ضرورت پڑی تو خانہ ساز نبوت بھی تخلیق کر لی۔ برطانوی استعمار نے اس مقصد کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کی خدمات سے استفادہ کیا۔

قادیانی تحریک اپنے تصور' اپنے علم کلام' اپنی حکمت عملی اور اپنے اہداف کے حوالے سے ملت اسلامیہ سے الگ ایک دھڑا ہے۔ ان کے الگ ہونے پر کسی کو اعتراض نہیں۔ البتہ جب وہ استعمار کی کاسہ لیسی کرتے اور اسلام کے بنیادی تصورات کو مسخ کرتے وقت اسے عین اسلام اور اپنے آپ کو "اصلی مسلمان" قرار دیتے ہیں تو پھر اہل اسلام کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اصل حقائق کو بے نقاب کریں۔

قادیانی تحریک درحقیقت کوئی مذہبی تحریک نہیں بلکہ یہ ایک خالص سیاسی تحریک ہے' جس کے اہداف اسے ایسی منزل پر لے جاتے ہیں جہاں مسلمانوں کو سوائے خسارے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اسی لیے ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ: "احمدیہ تحریک نے ہند اور بیرونی دنیا میں برطانوی استعمار کی خدمت انجام دی ہے"۔

زیر نظر کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی منفرد کاوش ہے' جس میں بشیر احمد صاحب نے بڑی محنت سے برطانوی ریکارڈ' اور قادیانی لٹریچر کو اپنی حرارت ایمانی سے اس طرح کھنگالا ہے کہ اس تحریک تلبیس کی داخلی جہت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ انھوں نے کوئی بات بلاحوالہ نہیں کہی' کہیں اپنے لہجے کو بگڑنے نہیں دیا' اور منظریوں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے کہ قادیانیت اپنے اصل چہرے کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔

اردو میں اس طرح کا لٹریچر تو کسی نہ کسی درجے میں موجود تھا' لیکن انگریزی میں ایسی کتب ناپید تھیں۔ ہمارا انگریزی زدہ طبقہ اگرچہ سانس تو پاکستان میں لیتا ہے لیکن سوچتا انگریزی میں ہے۔ ان لوگوں کے لیے یہ کتاب چشم کشا ہے۔ اسی طرح جنوبی افریقہ' بھارت' وسطی افریقہ' وسطی ایشیا اور یورپ میں قادیانیت زدہ پروپیگنڈے کے جواب کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے (سلیم منصور خالد)۔

مدیر کے نام

حسین صحرائی، ٹنڈو محمد خان

ہماری حکومت نے کئی ممالک سے مجرمین کو حوالے کرنے کے معاہدے کیے ہیں۔ تیونس، لیبیا اور دوسرے ممالک کے مجاہدین کو جنھوں نے جہاد افغانستان کے دوران جہادی سرگرمیوں میں بھرپور کردار ادا کیا، انھیں پکڑ کر ان کی حکومتوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ یہ افراد مجاہدین ہیں، جب کہ ان کی حکومت کی نظر میں قابل گردن زدنی۔ کئی کو ان کے ممالک میں سزائے موت دی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت انھیں، ان کے حوالے کرتی ہے اور وہ انھیں پھانسی یا فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیتی ہے تو شریعت کی رو سے ان کا خون کس کے سر ہے؟

راشد الیاس مہر، لاہور

شفاخانوں کے بارے میں ڈاکٹر غلام قادر لون کے مضمون (جولائی ۲۰۰۰ء) سے جیسے آنکھیں کھل سی گئیں۔ ہماری نسل نے تو مغرب کی برتری دیکھی ہے اور امریکہ اور یورپ کی ترقی نے ہماری آنکھیں چکاچوند کر دی ہیں۔ تاریخ کے اس طرح کے ابواب سے کچھ تسکین ہوتی ہے اور احساس کمتری دور ہوتا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ!

عرفان احمد، منچن آباد

اخوان المسلمون اردن کے بارے میں مقالے (جولائی ۲۰۰۰ء) سے اس دور میں تحریکی جدوجہد کے بہت سے پہلو آشکار ہوئے۔ کچھ کا اطلاق اپنے حالات پر بھی کر سکتے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ جن ممالک میں بھی غلبہ اسلام کی تحریکیں چل رہی ہیں ان کے معروضی مطالعے آپ کے رسالے میں پیش کیے جائیں، مثلاً ملائیشیا۔ یہ اس تحریک سے وابستہ لوگ لکھیں یا بہتر ہے کہ دوسرے ملک کا آدمی جائے، قیام کرے اور مطالعہ کر کے لکھے۔ عملی بصیرت حاصل کرنے کے لیے اسے ناگزیر سمجھنا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سن رکھو اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تفقہ نہیں ہے، اور اس علم میں کوئی بھلائی نہیں جس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے، اور اس قرآن خوانی میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تدبر نہیں ہے۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.